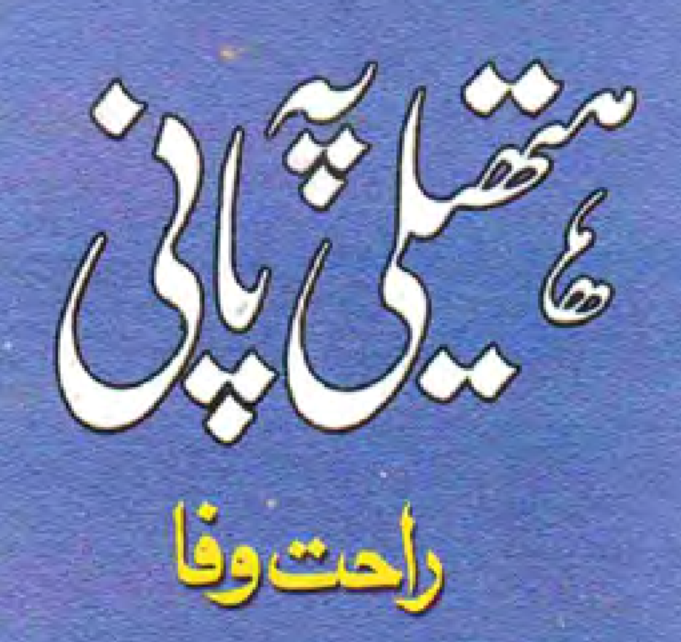


راحت وفا

ڈاکٹر عاصی کرنالی

راحت وفا علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز و معروف حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ راحت وفا کو ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے اور خدا نے انہیں عمدہ تخلیقی جوہر سے نوازا ہے اور اس طرح وہ ادبی روایت میں جدید عصری تقاضوں کے مطابق اپنی تحریروں سے اضافہ کر رہی ہیں۔ وہ ایک لیکچرار ہیں اور نئی نسل کو تعلیم و تربیت کی صورت میں فیض پہنچا رہی ہیں۔ اس طرح ایک علمی و تعلیمی ماحول انہیں میسر ہے۔ وہ مختلف صورتوں میں ادب تخلیق کر رہی ہیں۔ اس سے قبل ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''بارش میری سہیلی'' اور ایک ناول ''گڑیا'' شائع ہو چکے ہیں۔ اہل ذوق نے ان تصانیف کو قدر شناسی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ ریڈیو ملتان کے لئے ڈرامے افسانے اور کالم لکھتی ہیں۔ ابلاغ کے اس نشریاتی رابطے سے بھی ان کی ایک شناخت ہے۔ ان کی تحریریں ملک کے معروف اخبارات و جرائد میں چھپتی رہتی ہیں۔ نوائے وقت ملتان میں ''معاف کیجئے گا'' کے نام سے ان کے ہفتہ وار کالم چھپتے رہتے ہیں۔ اس تعارفی تمہید سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ راحت وفا ذوق ادب کے سفر میں کئی ارتقائی مراحل طے کر چکی ہیں۔ اب ان کا نیا افسانوی مجموعہ ''ہتھیلی پر پانی'' شائع ہو کر ہدیہ اہل نظر ہو رہا ہے۔

قارئین! مجھے راحت وفا کے افسانے پڑھ کر ان کی خصوصیات پر اظہار خیال کرنا ہے۔ افسانوں کے ناموں کے تنوع سے ان کے افسانوں کے مزاج کا کسی قدر اندازہ آپ سب بھی کر سکتے ہیں۔ کچے پکے گھر' ضمانت' یہ کیسی عورت ہے؟' باگی' آسیب' پرانا سوٹ کیس' خواہش کا سراب' کھڑکی سے باہر' پھر سے' ہتھیلی پر پانی' برف کا لباس اور بریسٹ کینسر وغیرہ۔ ان تمام افسانوں میں قدر مشترک جو ہے وہ ہے ''عورت'' یعنی بنیادی موضوع عورت ہے۔

محترم قارئین! خواتین دیر سے ادب میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔ اس لئے کہ خدائے عادل نے تخلیق کی استعداد مرد اور عورت دونوں کو عطا کی ہے۔ ہمارا خیال بلکہ یقین ہے کہ جب سے مرد کی سوچ نے اظہار کیا ہے اور اپنی فکر کو قلم کے وسیلے سے حوالہ قرطاس کیا ہے عین اسی وقت سے عورت بھی اپنے اس خداداد جوہر سے کام لے رہی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ادب کی تاریخوں اور تذکروں میں عورت کو نمائندگی نہایت کم ملی ہے۔ اس کی

شاید کچھ تہذیبی اور معاشرتی وجوہات ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اگر خواتین سے اس کا سبب پوچھیں تو وہ ایک ہی بات کہتی ہیں کہ یہ مرد کا معاشرہ ہے جس میں کما حقہ عورت کے حقوق کی پاسداری نہیں کی گئی ہے۔ تاہم اب وہ گھٹن نہیں ہے۔ خواتین ادب کے افق پر نمودار ہیں اور مردوں کی طرف سے ان کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اب دوسری بات' خواتین کہانی زیادہ لکھتی ہیں۔ افسانے اور ناول کی شکل میں ان کا کام مسلسل بھی ہے اور قابل قدر بھی۔ عورتوں کی کہانی میں گھریلو ماحول اور (اب) معاشرتی فضا کی نمائندگی بھرپور ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ جزئیات سے موضوع کو واضح کر دیتی ہیں۔ جب کوئی ادیب خاتون گھریلو ماحول پر قلم اٹھاتی ہے تو وہ عورت ہونے کے ناتے گھر کی فضا میں جذب ہوتی ہے۔ اس لئے عورتوں کے جذباتی' نفسیاتی' ذہنی مسائل' رشتوں کے تقاضے' ضروریات اور حرمتیں' رسم و رواج' میل جول وغیرہ کو اپنا مشاہدہ اور اپنا احساس بنا کر پیش کرتی ہے اور کیونکہ ہمارے عہد میں عورت گھر سے باہر بھی معاشرتی اور معاشی ذمہ داریاں ادا کرنے لگی ہے اس لئے بیرونی مسائل کو بھی جزورسی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ان دنوں ادیب خواتین کم لکھ رہی ہیں اور افسانوی مجموعے اور ناول کم شائع ہو رہے ہیں۔ اس صورتحال میں راحت وفا کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی نہایت خوشگوار بات ہے اور ہوا کے تازہ اور راحت بخش جھونکوں کی مانند ہے۔ راحت وفا نے تمام افسانوں میں عورت کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور موضوع کی یہ حد بندی اور ارتکاز بہت عمدہ بات ہے۔ اس لئے کہ راحت وفا ذہنی یکسوئی کے ساتھ عورتوں کے مسائل و احوال پر ہمیں اہم معلومات فراہم کر سکیں گی۔

راحت وفا اپنے افسانوں کی بافت میں ہر تلازمے کا خیال رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں افسانے کے کردار ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ نہ زیادہ نہ کم۔ کوئی کردار کسی حیثیت کا ہو اپنی جگہ اہم ہے۔ اسے حذف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح راحت وفا کے یہاں ماحول اپنے تمام مناظر و کیفیات کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اگر کوئی افسانہ گاؤں کی فضا رکھتا ہے تو گاؤں کی بھرپور سماجی زندگی کے عکوس و نقوش کہانی میں پیوست ہوں گے۔ اسی طرح راحت وفا مختلف موسموں سے بھی کہانی میں رابطہ قائم رکھتی ہیں۔ ادلتی بدلتی رتوں کے اثرات ان کے کرداروں اور ان کی کہانی کے پلاٹ سے جھلکتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے کردار کا

تعارف جہاں اس کی نوعیت عمل سے کراتی ہیں، وہیں ان کی زبان، اس کی گفتگو اور اس کے مکالموں سے اس کردار کو ہمارے دل و دماغ کا حصہ بنا دیتی ہیں۔ کہانی کے پلاٹ میں تحیر اور تجسس کا عنصر اور اس کا فطری اختتام یعنی کہیں تکلف اور تصنع کا گمان نہیں ہوتا۔ ایک برجستگی اور بے ساختگی پلاٹ سے عیاں ہے اور پھر راحت وفا کا ہر کہانی سے جو منشاء و مراد ہے۔ اس کا مطالبات و مقتضیات کے مطابق جدت اور تجربیت کا تحریری شاہ پارہ محسوس کیا ہے۔

اللہ راحت وفا کے ذہن کو شاداب و متحرک اور قلم کو رواں دواں رکھے۔ اور وہ ادب کی متنوع اصناف میں اسی طرح گل کاری اور گل افشانی کرتی رہیں۔ (آمین)۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی
29 جون 2006ء

راحت وفا کا ادبی سفر

جبار مفتی

نسائی ادب کی اصناف نثر میں طبع آزمائی کرنے والے بے شمار نام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے قارئین کو ایک عرصے سے اپنے قلم کے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ ان قلمکار خواتین نے ایک سے زائد اصناف میں اپنے جوہر دکھائے۔ تاہم بیشتر کی شناخت کوئی ایک صنف رہی محترمہ خدیجہ مستور، محترمہ رضیہ بٹ، محترمہ بشریٰ رحمٰن، محترمہ حجاب امتیاز علی، محترمہ خالدہ حسین، محترمہ رضیہ فصیح احمد، محترمہ بشریٰ اعجاز، محترمہ ش فرخ، محترمہ نیلم احمد بشیر، محترمہ نور الہدیٰ شاہ، محترمہ حسینہ معین، محترمہ فاطمہ ثریا بجیا، محترمہ بانو قدسیہ سے پورا ملک نہ صرف آشنا ہے بلکہ گرویدہ بھی ہے۔

اسی طرح جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی محترمہ اقبال بانو، محترمہ سائرہ ہاشمی ان کی بہن محترمہ جمیلہ ہاشمی، محترمہ نوشابہ نرگس، محترمہ ثمر بانو ہاشمی، محترمہ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی، محترمہ وردانہ نوشین نے افسانہ، ناول اور ڈرامہ میں بڑا نام کمایا ہے۔ ان میں محترمہ اقبال بانو، محترمہ ثمر بانو ہاشمی، محترمہ نوشابہ نرگس، محترمہ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی اور دردانہ نوشین تو شاعری میں بھی بڑے نام ہیں۔

ان تمام بڑی لکھاری خواتین کے ہوتے ہوئے نئی لکھاریوں کیلئے بہت مشکل ہے کہ وہ مقام اور شناخت بنا سکیں۔ تاہم صلاحیت اور محنت کا راستہ بھی نہیں روکا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال پہلے راحت وفا نے نثری ادب میں قدم رکھا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں دنیائے ادب کے بڑوں کی صف میں کھڑی ہو جائے

گی۔ آج وہ ایک طرف اپنے روزگار کی دنیا میں ترقی کی منازل بڑی محنت سے طے کر رہی ہے تو دوسری طرف اردو ادب کی چار اہم نثری اصناف میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھا رہی ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ' ناول' کالم' ریڈیائی ڈرامہ اور فیچر لکھ رہی ہے اور خوب لکھ رہی ہے۔

میرا اس سے پہلا تعارف اس کے افسانوں کے مجموعے ''بارش میری سہیلی'' سے ہوا۔ پھر اس کی زندگی میں آنے والے المیوں نے اس کی تحریر کو درد کا ایسا تڑکا لگایا کہ وہ پڑھنے والوں کے دلوں پر دستک دیتے شاہکار تخلیق کرنے لگی۔ اس نے روزنامہ نوائے وقت ملتان میں ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا جو قارئین میں مقبول ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے ریڈیو پاکستان ملتان کیلئے ڈرامے لکھنا شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قومی رابطے کے پروگراموں کیلئے ریڈیائی ڈرامے لکھنے لگی۔

دریں اثناء اس کے افسانے مختلف ڈائجسٹوں کی زینت بنتے رہے۔ پھر اس نے مزید ہمت کی اور ادبی جرائد کا رخ کیا۔ وہاں بھی اس کے افسانوں کو اعلیٰ ادبی معیار کا حامل قرار دیا گیا۔ گزشتہ سال اس کا ناول ''گڑیا'' شائع ہوا تو پڑھنے والوں کو پتہ چلا کہ وہ کس قدر مشاہداتی قوت رکھتی ہے۔ وہ آئے روز کے عام سے منظر میں وہ کچھ دیکھ لیتی ہے جو عام شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ راحت وفا ڈرامہ لکھے' کالم تحریر کرے' ناول تخلیق کرے یا افسانے سپرد قلم کرے وہ معاشرے میں پھیلی سچائیوں کو ہی موضوع بناتی۔ اس کے انداز تحریر میں جو دلکشی اور شیرینی ہے وہ قلم پر اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے قاری کے اندر تک اتر جاتی ہے اور وہ تحریر ختم ہونے کے بعد بھی ایک جذبے کی طرح اپنے پڑھنے والوں کو مسحور کئے رکھتی ہے۔ میں ایک قاری کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قلم میں جو اثر رکھا ہے اسے محنت کی آنچ سے لافانی بنانے کے سفر پر گامزن راحت وفا کا ادبی دنیا میں مستقبل روشن ہے' تابناک ہے۔

(جبار مفتی)

ملتان کے ادبی افق کا ایک روشن ستارہ......راحت وفا

ابھی ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا سنٹر کی ڈاکٹر سٹینا اسٹرہیلڈ کی فکری اور انتظامی نگرانی میں تین روزہ اردو ورکشاپ ہوئی جس کا موضوع تھا ''نظریہ اور قبول ثقافت'' اس میں دو مقالہ نگاروں..... ڈاکٹر یوسف خشک صدر شعبہ اردو شاہ لطیف یونیورسٹی خیر پور اور کرن نذیر علی (فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی راولپنڈی) نے خواتین افسانہ نگاروں کے معاشرتی شعور' سماجی وعدے' بصیرت اور زبان کے استعمال پر مقالات پڑھے تو مجھ سمیت بہت سے تیوری چڑھے نقادوں کا ماتھا ٹھنکا کہ مسلمہ تخلیق کاروں کے بجائے خواتین کے نئے نام لئے جا رہے ہیں۔ جن کی تخلیقی حیثیت کو ابھی تک نقادوں نے رجسٹریشن ایسا اعتبار نہیں بخشا اور خاص طور پر جب ایک مقالہ نگار نے ''پاکیزہ'' اور ''خواتین ڈائجسٹ'' کا نام لیا تو خود میں نے اس بدگمانی کا اظہار کیا کہ بعض مرد خواتین کے نام سے لکھ سکتے ہیں مگر زاہدہ حنا نے بتایا کہ ان ڈائجسٹوں میں خواتین ہی لکھتی ہیں۔ البتہ مردوں کے بعض ڈائجسٹوں میں ایسا امکان ہے۔ دوسرے مجھے یہ بھی یاد تھا کہ عورتوں کے ماضی کے مقبول دو رسالوں ''حور'' اور ''زیب النساء'' کی مناسبت سے حوری اور زیبی بہنیں ایک عرصے تک انہیں کہا جاتا رہا جن کے ہاں رقت قلبی' اشک آوری اور جذباتیت زیادہ ہو اور جو زندگی کے مرکب یا پیچیدہ تجربات سے صرف نظر کر کے زندگی کو محض سیاہ اور سفید رنگوں میں تقسیم کر کے تین چار موضوعات پر ہی ساری عمر لکھتی رہیں۔

جیسے بڑی بہن کا منگیتر چھوٹی سے شادی کر لے' عورت کی جذباتی لغزش اسے غیر

شرعی ماں بنا کر بالآخر ساملی سینٹوریم میں داخل کرا دے' ساس کا غیر انسانی رویہ یا شوہر کی تلون پسندی نئی دلہن کی زندگی کو اجیرن بنا دے۔ ظاہر ہے کہ قرۃ العین حیدر' عصمت چغتائی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' جیلانی بانو' واجدہ تبسم یا خالدہ حسین کی موجودگی میں کوئی نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کوئی خاتون افسانہ نگار اپنے تخلیقی تجربات اور ان کے اظہار میں کم تر درجے کی ہو سکتی ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ مرد ناقدین کے ہجوم میں خواتین تخلیق کاروں کا اپنے آپ کو منوانا کافی مشکل ضرور ہے۔ خاص طور پر پروین شاکر کی وہ نظم پیش نظر رکھیں جس میں مرد تحسین کاروں کو کسی خاتون تخلیق کار کی توصیف کرتے ہوئے رالیں ٹپکاتا دکھایا گیا ہے۔

یہ شاعروں سے زیادہ افسانہ نگاروں کے ساتھ ہوا ہے کہ ان میں سے بہت سوں کی زندگی کی روداد بجائے خود ایک بہت بڑا افسانہ ہوتی ہے۔ ملتان میں ایک بڑا شخص تھا۔ اس کا نام حشمت وفا تھا۔ وہ ترقی پسند فکر کا پرچار کرتا تھا۔ خوش مزاج اور کشادہ دل انسان تھا۔ ''امروز'' ملتان میں وہ کام کرتا تھا۔ دوست نوازی اس کی عادت تھی۔ پھر یہ ہوا کہ اس کا گھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑے تغیر کی لپیٹ میں آیا۔ مگر اس سب کا سامنا حشمت وفا نے بڑی جوانمردی سے کیا۔ پھر کئی برس گزر گئے میں نے ایک دھان پان سی لڑکی کو دیکھا جو بی اے کر رہی تھی اور بعد میں ایم اے اردو کرنا چاہتی تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ حشمت وفا کی بیٹی راحت وفا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک اضافی گوشہ پیدا ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بہت سی عمروں کا فاصلہ چند برسوں میں طے کر لیا۔

اس طرح سے اس نے بہت چھوٹی عمر میں بہت کچھ دیکھا۔ بہت سے رشتوں کا بھرم ٹوٹتے دیکھا اور بہت سارے چمکیلے لفظوں کا رنگ و روغن اترتے دیکھا۔ اس طرح ممکن ہے اپنی ذاتی سطح پر اسے تلخ کام ہونا پڑا ہو گا مگر ایک تخلیق کار کے طور پر اس کی زندگی میں ہمہ ہمی اور زرخیزی پیدا ہو گئی۔ اس کا ایک افسانوی مجموعہ ''بارش میری سہیلی'' ناول ''گڑیا'' اور ''ماہیا'' شائع ہو چکا ہے۔

اب یہ افسانوی مجموعہ ''ہتھیلی پر پانی'' شائع ہو رہا ہے۔ نوائے وقت ملتان میں ''معاف کیجئے گا'' کے عنوان سے اس کا ہفتہ وار کالم شائع ہوتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارے مرحوم وائس چانسلر ڈاکٹر محمد نصیر خان نے راحت وفا کے ایک کالم کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔

اس تذکرے پر میں چونکا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کے کالم کو اب وسیع تر قارئین میسر ہیں۔ ہم سب کی ایک بڑی تخلیقی درس گاہ یعنی ریڈیو پاکستان ملتان سے بھی راحت کے ڈرامے' افسانے' کالم اور فیچر نشر ہو چکے ہیں۔

زیر نظر افسانوں میں ایک دو تو ایسے ہیں جن میں کسی نومشق افسانہ نگار کی ان کمزوریوں کی جھلک ہے جس میں اس کی عاجلانہ جذباتیت' سماجی تبدیلیوں میں حائل رکاوٹوں کا احساس کیے بغیر ایک رومانوی ترنگ کے سہارے دنیا بدل دیتی ہے یا مرد کی برتری پر قائم اس معاشرے نے بعض مردوں کی طرف سے شادی' طلاق اور مزید شادی کو بے بسی یا اختیار کا کرشمہ بنانے میں ایسے مبالغے پیدا کرتی ہے جس میں عورت صرف بے زبان اور مظلوم دکھائی دیتی ہے۔ اور مرد ظالم' خود غرض اور بوالہوس کے طور پر پینٹ کیا جاتا ہے۔ جیسے ''پرانا سوٹ کیس''، ''ضمانت''، ''کھڑکی سے باہر''، ''آسیب''، ''برف کا لباس'' اس کے ایسے افسانے ہیں جو ایک طرف تو معاشرتی تضادات پر اس کی گہری نظر کو ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف عورت کے حسی وجود پر تعصب یا تشدد کے نشانات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ''خواہش کا سراب'' اپنے تاثر کے لحاظ سے ایک بہت اہم افسانہ ہو جاتا ہے۔

''ٹی وی پر جوتے' کپڑے کے اشتہار میں دکھائے جانے والے بچوں' جیسے کپڑوں کا تقاضا کرتا تو ماں فوراً جھڑک کر کہہ دیتی۔ ''ارے سپولیے کبھی شیشے میں شکل بھی دیکھ لیا کر......'' میں دل مسوس کر رہ جاتا...... یہ مشق جاری رہی۔ میرے اندر ماں کیلئے بھی غم و غصہ رہنے لگا...... اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا کہ میں بدشکل تھا...... حسین تو میرے دوسرے بہن بھائی بھی نہیں تھے۔ لیکن گزارہ تھے۔ میں بالکل ہی ناقابل برداشت نظر آتا تھا...... ''ہاہا! وہ ہنسی اور بولی......'' ''کالے کوے پہلے جا کر آئینہ دیکھ......'' اس نے کھٹ سے کھڑکی بند کی اور میں جیسے زمین میں گڑ گیا۔ میں نے چور نظروں سے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا...... پھر پیشانی پر آیا ندامت کا پسینہ میں نے بازو سے صاف کیا اور آگے چل دیا......
''انیس! باؤلا ہو گیا ہے کیا تو...... ارے ابھی تو شبنم اس گھر میں آئی بھی نہیں...... کہاں چھوڑ کر چلی گئی......؟ میں کھسیانا ہو گیا۔ انہیں کیا بتاتا کہ میں کس حالت میں ہوں......'' تاہم اس کے اختتام پر شبنم کی یہ گفتگو انشاء پردازی کا ایک تاثر تو پیدا کرتی ہے یا مصنف کے نقطہ نظر کی وضاحت بھی مگر بہت اچھے افسانے میں تخلیق کار کی فنی مداخلت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

''تو پھر چاند تاروں جیسے بچے ہی پیدا کیا کرو' کہتا چاند تارے پھول موتی اور ہوتا ہمارے جیسوں کا...... لوگ اسی لئے تو ہنستے ہیں۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''کس تھکن کی بات کر رہی ہو......؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ ''سفر شروع کرنے سے پہلے کی تھکن۔'' وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔ ''دیکھو! میں نے تمہیں حوصلہ کر کے روحانی طور پر قبول کر لیا ہے۔ جسمانی نہیں۔ میں ساری زندگی وفادار ملازمہ بن کر خدمت کروں گی۔ مگر جذبوں پر شکست کا سایہ نہیں پڑنے دوں گی۔'' ''آرام سے لیٹ کر میرا فیصلہ سنو' تمہیں اپنے بدشکل ہونے کا بخوبی احساس ہے' کیا کچھ نہیں سنا ہوگا تم نے...... اور مجھے اپنے حسن پر ناز ہے۔ اس کے ہونے نے مجھے روح کی تھکن دی ہے۔ میں یہ تھکن ختم کر کے آئی ہوں' اسے آگے منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ گرم جذبوں کے ملاپ سے کوئی شبنم یا پھر کوئی انیس دنیا میں آئے گا۔

لیکن اس کا سب سے اہم افسانہ ''کچے پکے گھر'' ہے جو اسے اردو کے اہم افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرتا ہے۔ اس کے ابتدائی فقروں میں جھکی نظروں' بند ہونٹوں' گونگے رہنے اور خاموشی کی تلقین کی مدد سے جو فضا بنائی گئی وہ اس کی فنی چابک دستی کو ظاہر کرتی ہے۔ میں رسماً نہیں کہہ رہا۔ اس کا یہ افسانہ بہت گہرا تاثر رکھتا ہے اور اس کے انجام میں بے پناہ صناعی اور رمزیت ہے۔

''ہمیشہ کی طرح جھکی نظروں اور بند ہونٹوں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں نے اور تازو نے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو بشیر اور نذیر کا پیغام یاد دلایا......'' ''میں نے جلدی سے گونگی کو تالی بجا کر بلایا۔ ''بنا بولے شور مچائے پورے گھر میں جو کام کاج سنوارتی پھرتی وہ گونگی ہر موقع پر انہیں پہلے یاد آتی......'' ''میری نظریں گونگی کے کمرے کی کھڑکی سے مدھم نظر آنے والی روشنی پر تھیں۔ میں نے گاؤں میں بہت دفعہ دیوار پر چلنے والی فلموں کے بارے میں سنا تھا۔ کھلے آسمان تلے' گھاس پر بیٹھ کر گاؤں کے لوگ ایک روپے میں دیوار پر چلنے والی فلموں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ چھوٹی سی مشینوں سے فلمیں چلانا گاؤں کے لوگوں کے لئے حیرت کی بات تھی۔ سچ مچ حیرت کی بات ہی تھی۔ دلخراش' درد میں ڈوبی آواز اور دیوار پر نظر آنے والی بھائی جی کی تصویر۔ تب میرے دل سے دعا نکلی۔ ''اے اللہ! تو کچے گھروں کی بھی حفاظت کر۔'' مگر دعا کا وقت قضا ہو گیا تھا۔

ملتان جیسے خطے میں نوشابہ نرگس' عفت ذکی اور ثمر بانو ہاشمی نے افسانوی کینوس پر جو نقوش ابھارے تھے میں بڑی خوش دلی اور امید کے ساتھ کہتا ہوں اس میں ایک حقیقی تخلیق کار کا اضافہ ہو چکا ہے۔ جس کے پاس تجربہ حیات بھی ہے۔ انسانی حزن و ملال کی معنویت کو چھونے کا سلیقہ بھی اور تخلیقی زبان پر عبور بھی۔

انوار احمد

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی' ملتان

3 اگست 2006ء

فہرست

کچے پکے گھر

آج ہماری شادی کا بیسواں دن تھا۔ جب شام ڈھلے بھائی جی بشیر اور نذیر کو کراچی کیلئے بس میں بٹھا کر لوٹے۔ ہمیشہ کی طرح جھکی نظروں اور بند ہونٹوں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں نے اور نازو نے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو بشیر اور نذیر کا پیغام یاد دلایا۔

''دیکھ! شانو! بھائی جی کا بہت خیال رکھنا' روٹی پانی' کپڑے لتے' دوا دارو' کوئی کمی نہ رکھنا۔ بھائی جی بیمار ہیں۔'' بشیر نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے جیسے عہد لے لیا۔

''او ہاں نازو! تو وی کن کھول کے سن لے۔ تم دونوں کو اس گھر میں لانے والے بھائی جی ہیں۔ ہمیں انہوں نے ماں باپ کا پیار دیا ہے۔ یہ پیٹ کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم کبھی کام کاج کیلئے کراچی نہ جاتے۔'' نذیر نے بھی بیوی کو سرتا پیر پکا کر دیا۔

''اوئے نذیرے! کوئی گل نہیں۔ جلدی جلدی گاؤں آتے رہیں گے۔ ہم بھائی جی سے دور زیادہ دن نہیں رہ سکتے۔'' بشیر نے بھائی کو کہا۔ میں نے ہولے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ بیس دن کی بیاہی بیویاں کس قدر آسانی سے چھوڑ کر وہ جا رہے تھے۔ ابھی تو مہندی ابٹن کی مہک بھی بدن میں رچی بسی تھی۔ ابھی تو بیاہے جذبوں سے پوری طرح شناسائی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ اتنی دور جا رہے تھے۔

''اوئے! کیا سوچنے لگی تو......'' بشیر نے میرا چہرہ اپنی طرف موڑ کر پوچھا۔

''کیا ضرورت ہے کراچی جانے کی؟ یہاں اپنی زمینوں پر محنت کرو۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''او پرجھائی! آٹھ مربعے زمین اتنی زیادہ بھی نہیں ہوتی۔ وہاں کوئی چھوٹا موٹا اپنا کام کریں گے۔ یہاں ساتھ والے دو مربے ماسی برکتے کے میری نظر میں ہیں۔ پیسے دے کر اپنے ساتھ رلالیں گے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ بھائی جی تمہارا خیال رکھیں گے۔ انہوں نے ہم سے بھی زیادہ تم دونوں کا خیال رکھنا ہے۔''

میرے دل میں بشیر کی بات نے پکی گرہ لگا دی۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور یہ یقین دلا دیا کہ ہم بھائی جی کا بہت دھیان رکھیں گی۔

نازو نے رنگین پھولوں والی چنگیز میں اپنے ہاتھوں سے پکائی روٹیاں رکھیں۔ دال پر مکھن کا پیڑا رکھ کے بھائی جی کی خدمت کا سنگ بنیاد رکھا۔ میں نے جلدی سے گونگی کو تالی بجا کر بلایا۔ وہ جلدی سے مرغی اور چوزوں کو بڑے سے ٹوکرے کے نیچے محفوظ کر کے میلے مٹی میں بھرے ہاتھ اپنی پھولدار قمیص سے صاف کرتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

میں نے اس کا بڑا سا دوپٹہ اچھی طرح اس پر لپیٹ دیا اور بھائی جی کا کھانا اسے پکڑا کر اشارے سے ان کے کمرے میں دینے کیلئے کہا۔ وہ صحن کے اندھیرے سے ہو کر سامنے بھائی جی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ان کے کمرے سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ گونگی واپس آتی دکھائی دی تو میں وہاں سے ہٹ گئی۔

وہ رات جوں جوں گہری ہو رہی تھی میرے اور نازو کے دل پر آریاں چل رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے نظریں بچا کر ہم اپنے دل میں جھانک رہی تھی۔ کبھی چوڑیوں کے شور میں اور کبھی گوٹہ لگے دوپٹے کی اوٹ میں اتھل پتھل جذبے سرکش ہو رہے تھے۔ مگر بشیر اور نذیر تو دونوں اس وقت سفر کر رہے تھے۔ دونوں بہنوں نے ایک ساتھ لمبی سانس بھری اور پھر خود سے سمجھوتہ کر لیا۔ ان کے کراچی جانے کا پروگرام تو ماسی دلاری نے تاریخ طے ہونے سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اماں اور بے بے کو کوئی اعتراض ہی نہیں ہوا تھا۔ ان کے لئے تو یہ اطمینان ہی کافی تھا کہ دونوں بیٹیاں وہ اپنے گھر چھوڑ کر جائیں گے۔ ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

میں نے ماسی دلاری سے چھپ کر یہ پوچھ لیا کہ بھائی جی کی اپنی بیوی کو تو ہم بوجھ لگیں گی۔

ماسی دلاری دیر تک ہنستی رہی اور پھر بولی۔ ''ارے اس رماں جوگے کی بیوی ہو گی تو کچھ کہے گی۔ وہ تو بیچارا کلم کلا ہے۔ بیماز خورے بچپن سے بیمار شمار رہتا ہے۔ بیوی کے لیک

ہوتا تو کب کی شادی کر لیتا۔''

مجھے اور نازو کو یہ جان کر بہت دکھ لگا تھا۔ دل ہی دل میں ہمیں بھائی جی سے بہت ہمدردی ہوئی۔ انہوں نے سچ مچ دل کے ارمان نکالے۔ حیثیت سے بڑھ کر خرچہ کیا۔ تقریباً آدھے گاؤں کی دعوت کی' خوب ڈھول ڈھمکا کرایا...... جب میں نے اور نازو نے دوپٹے کی اوٹ سے تھوڑا سا جھک کر سلام کیا تو انہوں نے دعائیں دیں اور کرتے کی جیب سے پانچ سو روپے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔

''شانو! تم بڑی ہو مل کر بانٹ لینا۔'' مجھے بہت خوشی ہوئی۔ پھر جتنے دن بھی گزرے بہت اچھے گزرے۔ بھائی جی کم بولتے مگر توجہ چاروں طرف رکھتے۔ سب کی ہر طرح فکر رکھتے۔ گھر کے صحن میں ٹوکرے کے اندر بند چوزوں سے لے کر ڈربوں میں بند مرغ مرغیوں تک کا حساب رکھتے۔ بھوری بھینس اور سفید گائے پر ان کی نظر رہتی۔ بنا بولے شور مچائے پورے گھر میں جو کام کاج سنوارتی پھرتی وہ گونگی ہر موقع پر انہیں پہلے یاد آتی۔

''گونگی تقریباً پندرہ سولہ سال کی تھی۔ گاؤں کے قریب سے جب سیلاب گزرا تھا تو اس کے منہ زور ریلوں نے اسے ان کی زمینوں پر لا پھینکا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تین چار سال تھی۔ تب سے اب تک وہ اسی گھر میں تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ نجانے بدنصیب کس گھر کا اجالا تھی۔ شادی کے تیسرے دن مجھے بشیر نے گونگی کے بارے میں فقط اتنا ہی بتایا۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ قسمت کے لکھے کو کون بدل سکا ہے......؟''

''گونگی! بھائی جی کچھ کہہ تو نہیں رہے تھے۔'' نازو نے اس سے پوچھا۔

''آں' نہ آں......''

''چل تو بھی روٹی کھا لے۔'' نازو نے صحن میں سے باورچی خانے کا رخ کیا۔ میں بھی ان کے پاس ہی چلی آئی۔ نازو نے ایک کٹورے میں دال ڈال کر گونگی کو دی۔ وہ وہیں فرش پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

''اس وچاری پر بھی مجھے بس رحم آتا ہے۔''

''ہاں! خورے یہ کبھی اپنے گھر وی جا سکے گی کہ نہیں۔''

''اوں' ہوں' کھو کھو......'' ایک دم ہی صحن میں بھائی جان کی آواز آئی۔ ان کی عادت تھی وہ گلا کھنکارتے ہوئے اپنے آنے کی اطلاع دیتے تھے۔ میں نے اور نازو نے

جلدی سے دوپٹے سر پر کھینچ کر لمبے کر لئے۔

''اوئے کرماں والیو! آج دودھ کا گلاس گرم کر کے دینا ہے' حکیم صاحب نے ٹھنڈے دودھ سے منع کیا ہے۔''

''اچھا بھائی جی!'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اور چھیتی چھیتی سو جانا' سویرے نماز نہ نکل جائے۔''

''جی بھائی جی!'' نازو نے یہ کہہ کر تیز تیز نوالے چبانے شروع کر دیئے۔ گویا یہ بھائی جی کا حکم تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تو وہ فوراً روٹی چھوڑ کر سونے چلی جاتی۔ میرے اشارے پر کچھ جھینپ سی گئی...... جونہی بھائی جان گئے دور سے ان کے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تو میں نے نازو کی بے ستی کی۔

''اوئے! تو تو بہت ای بھائی جی والی ہوگئی اے......''

''بڑی تجھے پا بشیر کی باتیں بھول گئی ہیں کیا......؟'' نازو نے یاد دہانی کرائی تو میں چپ کر گئی۔ جلدی سے نوالے منہ میں ڈالے اور برتن سمیٹ کر گونگی کے حوالے کیے۔ گونگی کو تو ہم سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ ٹوٹی کی منہ زور دھار میں وہ برتن دھو کر فارغ ہوگئی۔ برتن لوہے کے ٹوکرے میں ڈال کر اس نے قمیص کا دامن بل دے کر نچوڑا...... شلوار کے پائنچے بھی اچھی طرح نچوڑے اور میری طرف آئی۔

''آں' آں' ہیں......'' وہ اشاروں سے بولی۔ میں کچھ نہ سمجھی پر نازو کے پلے کچھ بات پڑ گئی۔

''ہم اپنے اپنے کمروں میں سوئیں گی۔''

''آں' ہا......'' اس نے اطمینان بھری آواز نکالی۔

''میرا خیال ہے بھائی جی کے لئے دودھ گرم کر کے بھیج دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اور پھر خود ہی جلدی سے دودھ کی بھری دیگچی سے گلاس بھر دودھ چھوٹی دیگچی میں نکال کر چولہے پر رکھ دیا۔ نازو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ہم دونوں کے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ ہمارے کمروں کے سامنے ہال کمرہ تھا جس میں ہم سارا دن اٹھتے بیٹھتے' سب آئے گئے اسی میں رہتے۔ ہال کمرے کے پیچھے غسل خانہ تھا۔ سارا گھر ایک ہی غسل خانہ استعمال کرتا تھا۔ بس غسل خانہ بھائی جی نے بشیر نذیر کی خواہش پر نئی طرز کا بنوایا تھا۔ ہال

کمرے کی سیڑھیاں اتر کے صحن تھا۔ صحن کے دائیں طرف پرانے سامان اور گندم چاول رکھنے کا سٹور سا تھا۔ جس میں ایک طرف گونگی کا پلنگ بچھا تھا۔ اور پلنگ کے نیچے ہی لوہے کا ٹرنک تھا جس میں اس کے نئے پرانے کپڑے تھے۔ صحن میں گھر کا داخلی دروازہ تھا۔ جس کے ساتھ بائیں طرف بھائی جی کا کمرہ تھا۔ سارا وقت وہ کھو پر ہوتے تھے۔ یا پھر اپنے کمرے میں۔ زمینوں کا سب حساب کتاب وہ خود لکھتے تھے۔ کوئی منڈی جانے کا کام ہوتا تو بشیر یا نذیر میں سے کوئی ایک ان کے ساتھ شہر جاتا تھا۔ اب وہ دونوں کراچی چلے گئے تھے تو بھائی جی کو مشکل پیش آتی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اوپر سے ان کی بیماری۔

لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے اور ہر مرض کا علاج بھی ہوتا ہے۔ صرف حل ڈھونڈنے' علاج کے صبر آزما مرحلے سے گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھائی جی نے بھی شہر کے کام کاج اور دوسرے زمینوں کے کام کے لئے ساتھ والے گاؤں سے جگری دوست اللہ بخش چودھری کے ہاں سے کسی سمجھدار کامی کو بلا لینے کیلئے رمضو کوچوان کے ہاتھ اللہ بخش چوہدری کو پیغام بھجوا دیا تھا۔ رمضو روز صبح سویرے سواریاں لے کر ساتھ والے گاؤں تک جاتا تھا اور پھر شام کو یہاں کی سواریاں لے کر لوٹتا تھا۔ شام کو رمضو نے آ کر بھائی جی کو اللہ بخش چوہدری کا پیغام دیا کہ اک دو روز تک نواز نام کا نوجوان آ جائے گا۔

گونگی نے بھائی جی کا ناشتہ صحن میں پڑے پلنگ پر رکھ دیا۔ رنگین بڑے بڑے پایوں والے پلنگ پر خوشنما بیل بوٹوں والے تکیے رکھے تھے۔ پائنتی میں ملتانی کھیس پڑا تھا۔ میں لسی کا گلاس لے کر آئی تو بھائی جی ناشتے کے لئے بیٹھے تھے۔ میں نے لسی کا گلاس ان کے سامنے رکھا تو وہ بولے۔

''اوئے بختاں والی! سکھی رہ' مجھے حکیم صاحب نے لسی پینے سے منع کیا ہے۔ مجھے دودھ گرم کر کے دیا کرو۔''

''بھائی جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' میں نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح جما کر پوچھا۔

''ہاں! کافی بہتر ہو رہی ہے۔'' انہوں نے دیسی گھی میں تر بتر روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آں۔ آں......'' گونگی نے اشارے سے کچھ پوچھا۔

''اوئے ہاں ہاں' جا کر کمرے کی صفائی......'' وہ گونگی کی بات فوراً سمجھ گئے تھے۔ گونگی ان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں واپسی کیلئے مڑی تو بھائی جی نے کہا۔

''اج یا کل ساتھ کے گاؤں سے نواز نامی جوان آئے گا۔ وہ کچھ عرصہ ہمارے پاس رہے گا۔ اس کا منجا بستر کہیں لگا دینا۔

میں نے نہ ہاں کی اور نہ ناں۔ بس یہ سوچتی ہوئی آ گئی کہ گھر میں تو کوئی اور کمرہ ہی نہیں ہے۔ نازو نے مشورہ دیا کہ برآمدے میں رات کو منجا لگا دیا کریں گے۔ چکیں ڈل جاتی ہیں' کوئی ٹھنڈ نہیں رہتی۔ میرے دماغ میں یہ بات آ گئی۔

سچ مچ وہ شام کو رمضو کے ٹانگے میں بیٹھ کر آ گیا۔ اچا لمبا گبرو جوان۔ سلیٹی شلوار سوٹ پہنے' بھائی جی دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور رات گئے وہ برآمدے میں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے گونگی کو اس کے کمرے میں بھیجا اور خود اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کمرے میں کچھ گھٹن سی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کر بڑے بڑے پھولوں والا موٹا سا پردہ پھیلا دیا۔

میں نے دوپٹہ مسہری کے سرہانے رکھا اور خود لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی میرے وجود میں جیسے بشیر کے لئے سوئی ہوئی کسک جاگ اٹھی۔ میں نے دو تین کروٹیں بدلیں اور پھر سو گئی۔ رات بھر بشیر کے بازوؤں میں' میں پگھلتی رہی۔ اس سے لپٹتی رہی مگر صبح رات کے جذبات کا اثر نازو کی گردن پر دیکھ کر میں پاگل ہو گئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر دبوچ لیا اور اس کے کمرے میں لے گئی۔ کمرے کا حال بھی کچھ مخفی نہ تھا۔ اس کی کلائیوں سے سرخ شادی کی چوڑیاں کرچی کرچی ہو کر بستر پر اور زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے بال جھٹکے سے چھوڑ کر اس کی زخم شدہ کلائی پکڑ لی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

''کیا تو نے نذیر کا پتلا بنا لیا ہے جو رات بھر اس سے کھیلتی رہی بول۔'' میری آواز میں شیرنی کی گرج تھی مگر لہجہ دبا دبا تھا۔ تاکہ برآمدے میں سویا نواز نہ سن لے۔ نازو کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گالوں پر پھیل گئے۔ اس نے گردن میرے سامنے کر دی۔ گہرا سرخی مائل نیل کا نشان میرے اوسان خطا کر گیا۔

''تو بولتی کیوں نہیں؟''

میں نے پھر بال نوچ کر اس کی گردن اوپر کی طرف کھینچی۔ وہ بھوں بھوں کر کے رو دی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس نے بے بس نظروں سے دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلا کر میرے ہونٹ سی دیئے۔ بنا چاہے' بنا خواہش کے وہ استعمال ہو گئی۔ ''ک' ک' کون......؟'' لفظ ہرن کے منہ سے نکلنے والی درد بھری آواز میں ڈھل گئے۔ نازو نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ میں بہت کچھ سمجھ گئی کہ نازو ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟ کیونکہ وہ لاعلم ہے۔ اس نے زمین پر سے روتے ہوئے چوڑیوں کے ٹکڑے مٹھی میں بھرے اور سسکیاں لیتے ہوئے منفی انداز میں گردن ہلانے لگی۔ ان کرچیوں کے علاوہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اپنی بربادی کا۔ میں نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر دوپٹہ اس کی گردن پر اچھی طرح لپیٹ دیا۔ میں خود بھی وہیں فرش پر اس کے ساتھ گر گئی۔ دماغ میں دھواں تھا۔ کانوں سے شاں شاں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بند دروازہ اور کھلی کھڑکی کس کا نام لوں؟ کس سے ذکر کروں؟ ''بھائی جی سے......'' نہ نہ۔ نہیں وہ تو ہمیں گھر سے باہر نکال کر دیں گے۔ کیا نواز......؟ اک رات میں ہی نواز...... میرا سر چکرانے لگا...... نازو تو زرد پتوں کی طرح پیلی پڑ گئی تھی۔ رو رو کے اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ میں نے اٹھ کر اچھی طرح گھوم پھر کے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی گھر کے صحن میں ہی کھلتی تھی۔ اتنی اونچی نہیں تھی کہ کوئی کمرے میں نہ آ سکے۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ کوئی کھڑکی کے راستے کمرے میں آیا اور گیا۔

''ٹٹ پینی! تو نے شور کیوں نہ مچایا۔'' میں نے جھلا کر دو ہتھڑ نازو کے کندھے پر مارے۔

''میرے منہ پر اس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔'' وہ رو دی۔

''اتنی دیر میں تیرا دم نہ نکلا' مر ہی جاتی تو چنگا تھا۔ بول اب کس کو پکڑیں؟ کس کا نام لیں......؟ دن چڑھ گیا ہے ابھی چولہا چوکی کرنا ہے۔ تیری میت کا سوگ مناؤں یا خاموشی کا زہر پی لوں۔'' میں اس کی حالت زار پر خود بھی رو دی۔

''اوں۔ آں' آں......'' گونگی نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور نازو پر بھی سر سے پیر تک چادر ڈال دی۔

''جتنا رونا ہے' ماتم کرنا ہے کمرے میں کرنا۔ باہر کسی کو بھنک نہ پڑے۔'' میں نے دھیرے سے کہا اور دروازے کی طرف آ کر دروازہ کھول دیا۔

''آں' آں......'' گونگی باہر کھڑی تھی۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ بھائی جی صحن میں بیٹھے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں۔ میں نے سر پہ دوپٹہ ڈالا اور پوری ہمت سے صحن میں آ گئی۔

بھائی جی اپنے مخصوص پلنگ پر گاؤ تکیے کا سہارا لئے لیٹے تھے۔ ان کی پائنتی میں نواز بیٹھا تھا۔ بھائی جی بہت دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ کسی بات پر کھلکھلائے...... مجھ پر نظر پڑی تو ایکدم بولے۔

''خیری صلا اے بھئی! دن چڑھ گیا ناشتہ پانی' نواز کیا سوچے گا؟''

''جی! بس ابھی ناشتہ بناتی ہوں۔''

''اور چھوٹی نظر نہیں آ رہی......'' بھائی جی نے پوچھا تو میں کانپ سی گئی۔

''وہ' وہ بیمار ہے...... اپنے کمرے میں ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے نواز کے چہرے پر کچھ دیکھنا چاہا۔ مگر وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''خیر اے' کیا ہوا......؟''

''بس سر میں درد ہے' بخار سا ہے۔''

''اوئے نواز! ناشتہ کر کے حکیم فتح محمد سے چھوٹی کے لئے دوائی لے آئیں۔''

''جی اچھا......'' نواز نے مختصراً کہا۔

میں نے دل و دماغ میں بھڑکتی آگ پر جیسے پراٹھے پکائے جو جل کر سیاہ ہو گئے۔ گونگی نے لسی کے جگ کے ساتھ جلے ہوئے پراٹھے بھائی جی اور نواز کے سامنے رکھ دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ ویسے کے ویسے واپس آ گئے۔ میں شرمندہ سی ہو گئی۔

''اوئے کڑیئے! کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ......'' بھائی جی وہیں آ گئے۔

''نہ' نہیں' بس سب خیر ہے۔'' میں چونک کر ہکلائی۔

''اچھا میں کھو پر جا رہا ہوں۔ نواز دیسی مرغ ذبح کر کے دے گا۔ اس کی یخنی بنا لینا۔ ایک پیالہ چھوٹی کو بھی دینا۔ نواز نے کھاد لینے کے لئے شہر جانا ہے۔ کچھ منگانا ہو تو منگوا لینا۔

''جی......'' میں نے فقط اتنا ہی کہا۔ بھائی جی چلے گئے۔ میں ان کے جاتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کسی کام میں دھیان نہیں تھا۔ غم و غصے سے برا حال تھا۔ کس سے پوچھوں؟ کس کو پکڑوں؟ چھوٹی تو اتنی کمزور نکلی' تو نے چوں بھی نہیں کی۔'' میں کھول اٹھی۔ اس کے کمرے میں گھس کر کنڈی لگائی اور جھٹکے سے اس کے منہ پر سے چادر کھینچ لی۔ اس نے رو رو کے برا حال کر لیا تھا۔ رات میں ہی وہ نچڑ گئی تھی۔ سرخ سفید گال زرد پڑ گئے تھے۔

''تو نے کچھ ہمت نہیں کی کیوں؟ زبردستی میں تو عورت پہاڑ بھی سرکا دیتی ہے تو نے کیسے اسے کھیلنے دیا بول۔ اب کیا منہ لے کر جائے گی نذیر کے سامنے۔ یہ جسم کا جھوٹا برتن نذیرے کے قابل رہ گیا ہے کیا؟ بولتی کیوں نہیں......؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''خدا کے واسطے چپ کر جا۔ مجھے زہر دے دے۔ میرا گلا دبا دے۔ میں نذیر کے قابل نہیں رہی۔'' نازو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے ماں کی طرح اس پر ترس آیا۔ آخر میری چھوٹی بہن تھی۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ اور میں سوچوں میں گھری یہی سوچتی رہی کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ کیا نواز سے پوچھنا چاہئے؟

پھر جیسے ہی نواز دوائی لے کر آیا میں نے اسے قریب ہی بیٹھنے کو کہا۔ وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔

''نواز! ایک بات پوچھنی تھی۔''

''جی بڑی بی بی پوچھیں۔''

''رات تمہیں نیند تو ٹھیک آئی تھی ناں' ٹھنڈ تو نہیں لگی۔''

''نہیں جی! بہت اچھی نیند آئی تھی۔''

''مطلب تم صبح ہی جاگے تھے۔''

''جی۔ نماز کے وقت تو کیسی بھی نیند ہو آنکھ فوراً کھل جاتی ہے۔ میں نے بھائی جی کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔'' میں لاجواب ہو گئی۔

''اچھا! ٹھیک ہے جاؤ۔'' میں نے نواز کو بھیج دیا۔ وہ چلا گیا اور پھر سوچ کے تانے بانے میں میں الجھ گئی۔

زندگی عجیب کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔ نازو دھیرے دھیرے گھل گھل کر بستر سے لگتی

جا رہی تھی۔ اس نے ہنستا مسکرانا' کھانا پینا سب چھوڑ رکھا تھا۔ میرے دلا سے بھی بے اثر ہو گئے تھے۔ بھائی جی بھی متفکر تھے۔ روز حکیم فتح محمد کی دوائیاں تبدیل ہو کر آ رہی تھیں۔ نواز شہر گیا ہوا تھا۔ اس نے شام کو آنا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ نواز آئے گا تو نازو کو گاؤں بھجوا دوں گی۔ اس کا دل بہل جائے گا۔ مگر شام سے پہلے ہی موسم اتنی تیزی سے بدلا کہ نواز کا گاؤں پہنچنا بھی مشکوک ہو گیا۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں چھائیں' تیز طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بھائی جی نے کمرے کی کھڑکی سے منہ نکال کر گونگی کو بلایا۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی شڑاپ شڑاپ پانی میں چل کر ان کے پاس گئی۔ واپس آئی تو میرے لئے پیغام لائی کہ پکوڑے بنائے جائیں اور انڈے ابالے جائیں۔ بہت ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔'' میں نے گونگی کو سمجھانا چاہا کہ بجلی تو ہے نہیں اتنے اندھیرے میں کیسے پکوڑے بنیں گے۔'' مگر یہ بات دل ہی میں رہی۔ گونگی تو بس میری مدد کو تیار تھی۔ فوراً پکوڑوں کے لئے آلو کاٹنے لگی۔ میں نے نا چاہتے ہوئے بھی لوہے کی کڑاہی چولہے پر رکھی اور چولہا جلایا۔

بارش کا زور کچھ کم تو ہوا تھا مگر برسنے کا سلسلہ جاری تھا۔ گونگی بھائی کے کمرے سے خالی برتن لائی تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اسے اس کے کمرے میں کپڑے بدلنے کے لئے بھیجا۔ وہ کچھ دیر میں کپڑے بدل کر میرے پاس آ گئی۔ چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے اسے گرم دودھ دیا۔ وہ انکار کرتی رہی پھر میرے مجبور کرنے پر پی گئی۔ بھائی جی کو عشاء کی اذان سن کر میں نے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ جب وہ واپس آئے تو میں صحن میں ایک منٹ رک کر بولے۔

''اوئے کڑیو! یہ طوفانی بارش ہے' کبھی تیز اور کبھی آہستہ ہوتی ہے۔ مگر رات بھر ہوتی رہے گی۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔''

''بھائی جی! نواز......'' میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''نواز اب صبح ہی آئے گا۔ اگر آیا تو میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم لوگ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔''

''بھائی جی! دوائی کھا لیں میں گرم دودھ بھیجتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''دوائی تو حکیم صاحب نے میری بند کر دی ہے۔ دودھ بھیج دو۔'' اور چھوٹی کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے بارش سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

''بس وہ بھی ٹھیک ہی ہے مرن جوگی۔'' آخر لفظ میں نے دھیرے سے کہا۔ گونگی کو دودھ دے کر بھیجا۔ چولہے کی آگ ٹھنڈی کی اور میں دودھ کا پیالہ لے کر نازو کے کمرے میں آ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سے میں نازو کے ساتھ ہی سوتی تھی۔

''اوں' آں' آں......'' گونگی نے آ کر مجھ سے اپنے بارے میں پوچھا۔

''تم بھی جا کر سو جاؤ'' میں نے کہا اور اس کے جاتے ہی کمرے کی کنڈی لگا لی۔ کھڑکی بند کر لی۔ بجلی تو اب تک آئی نہیں تھی۔ میں نے لالٹین کی بتی اوپر کر کے ماچس کی تیلی دکھائی تو کمرے میں پھیلی تاریکی کچھ کم ہو گئی۔ نازو کے چہرے پر پھیلی زردی ہلکی روشنی میں بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

''نازو! ہمت سے کام لے۔ اس اذیت ناک رات سے باہر نکل آ۔ کبھی بھی' کسی وقت نذیر آ گیا تو کیا ہو گا؟''

''میرا جینے کو دل نہیں کرتا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

نازو نے اس واقعہ کے بعد سے اب تک نہ چوڑی پہنی تھی' نہ آنکھ میں کاجل ڈالا تھا اور ایک جوڑا جو میں نے بدلوایا تھا اس کے بعد سے دوسرا جوڑا نہیں بدلا تھا۔ اس کے بال الجھ چکے تھے۔ ہونٹوں کی نرمیاں' خشک پپڑیوں میں بدل چکی تھی۔

''اپنا حلیہ ٹھیک کر۔ بھائی جی بار بار پوچھتے ہیں۔ کسی دن دیکھنے کمرے میں آ گئے تو کیا سوچیں گے۔''

''میرا خون کھولنے لگا ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنے گناہگار کو جانتی تک نہیں۔ اس نے رات کے اندھیرے میں' مجھے بے عزت کیا اور میں اس سے لاعلم ہوں۔'' نازو کو یہی صدمہ تھا کہ کاش مجرم کا پتہ تو چل جاتا۔

''مجرم کا پتہ کر کے کیا لینا ہے تجھے۔ اسے اللہ پر چھوڑ دے۔ اچھا ہی ہے کہ تو نے

اسے نہیں دیکھا ورنہ اور زیادہ گھن کھاتی اور زیادہ اپنی بے بسی پر روتی۔''

''اور وہ اب کتنا خوش ہوگا کہ اس نے.....''

''چپ کر بے عقلی! تیرا مقدمہ اللہ کی عدالت میں بہت سچا ہے۔ تو تو ایک مظلوم ہے جس نے اپنے ظالم کو دیکھا بھی نہیں۔ اللہ اسے دیکھتا بھی ہوگا اور اک روز دکھائے گا بھی۔'' میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

باہر بارش کے پانی کی بیتابیوں کا شور تھا۔ شاید بارش پھر سے تیز ہوگئی تھی۔

''اللہ خیر کرے کچے گھروں کے لئے اتنی بارش بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔'' بے اختیار ہی میں نے اللہ سے دعا کی۔ نازو نے دودھ کا پیالہ خالی کیا۔ میں نے اس کا سر گود میں رکھا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''نواز نہیں آیا.....'' ایک دم نازو نے پوچھا۔

''موسم بہت خراب ہے۔ وہ سویرے ہی آئے گا اور کل تو شاید وہ واپس اپنے گاؤں چلا جائے۔ فیر ہفتے بعد آئے گا۔'' میں نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر اس کے برابر لیٹتے ہوئے بتایا۔ وہ غنودگی سی میں تھی۔ پھر کچھ نہیں بولی۔ میں نے بھی آنکھیں موندھ لیں۔ مگر بڑی بے چینی سی تھی۔ باہر طوفانی موسم تھا۔ ٹھنڈ میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔ مجھے سردی سی محسوس ہوئی۔ پیر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ میں نے پیروں میں پڑے لحاف کو ٹانگوں پر ڈالا تو بہت سکون سا ملا۔ میں تقریباً نیند میں تھی زور سے آسمانی بجلی کڑکی' بادل گڑگڑاہٹ کے ساتھ شدت سے برسے۔ اپنے شعور میں آج پہلی مرتبہ میں نے ایسا طوفان خیز موسم دیکھا تھا۔ گھبرا کر میں اٹھی بیٹھی۔ اللہ سے دعائیں کرنے لگی۔ ہمارا گھر تو پکا تھا' باقی گاؤں میں زیادہ تر تو کچے گھر تھے۔ مجھے سب کی بہت فکر ہونے لگی۔ میرے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ ''اے اللہ! کچے گھروں کی حفاظت کرنا۔'' میں پکے گھروں کی حفاظت کی دعا کرنی بھول گئی۔ گھر کچے ہوں یا پکے اللہ کی حفاظت تو سب کو چاہئے ہوتی ہے۔ مگر میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا۔

ایک مرتبہ پھر زور سے بجلی چمکی اور آں.....آں.....آں آں آں آں!!! دلخراش' کربناک آواز طوفانی موسم میں بھی دور دور تک دلوں کے آر پار ہوگئی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔

لحاف دور پھینک کر ننگے پاؤں بھاگ کر دروازہ کھولا اور ٹھنڈ میں منہ زور برش کا

طوفان خیز حملہ بنا کسی رکاوٹ کے برداشت کرنے کے لئے میں نے صحن کے فرش پر کھڑے پانی میں پاؤں ڈالے..... مگر میرے پاؤں جیسے برف بن کر وزنی ہو گئے۔ سر سے پیر تک میں بھیگ گئی۔ آسمانی بجلی میرے سر پر جیسے چکر لگا رہی تھی۔ میری نظریں گونگی کے کمرے کی کھڑکی سے مدھم نظر آنے والی روشنی پر تھیں۔ میں نے گاؤں میں بہت دفعہ دیوار پر چلنے والی فلموں کے بارے میں سنا تھا۔ کھلے آسمان تلے گھاس پر بیٹھ کر گاؤں کے لوگ ایک ایک روپے میں دیوار پر چلنے والی فلموں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ چھوٹی سی مشینوں سے فلمیں چلانا گاؤں کے لوگوں کیلئے حیرت کی بات تھی۔ سچ مچ حیرت کی بات ہی تھی۔ دلخراش' درد میں ڈوبی آواز اور دیوار پر نظر آنے والی بھائی جی کی تصویر جیتی جاگتی تصویر..... تب میرے دل سے دعا نکلی اے اللہ! تو پکے گھروں کی بھی حفاظت کرے .....'' مگر دعا کا وقت قضا ہوگیا تھا۔



قیمت

اب کی بار وہ پورے پچیس دن بعد آیا تھا۔ رحیما نے اسے دیکھتے ہی آلو کی بھجیا بنا ڈالی۔ روٹیوں پر اچھی طرح گھی لگایا اور پھر آخری نوالہ لینے تک وہ بغور اسے دیکھتی رہی۔

پانی کا گلاس غٹ غٹ کر کے حلق سے انڈیل کر دستر خوان سے گھی میں بھیگی انگلیاں صاف کر کے جونہی مستری فیض بخش نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے یاد دلایا۔

''تو بھول گیا ہے۔ پہلے چسکا لے لے کر آلو کی بھجیا کھاتا تھا۔ اخیر میں انگلی سے پلیٹ چاٹتا تھا۔''

''اوئے جانور بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کو کبھی کبھی کوئی دوسرا شکار کر لیتے ہیں۔ میں تو پھر انسان ہوں پچھلے ست سالوں میں ہر پندرہ دن بعد آلو کی بھجیا ہی کھائی ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ شہروں میں آلو کی بھجیا کتنے اسٹیل (اسٹائل) سے بنائی جاتی ہے۔ امریکہ میں ایک ہی دن میں پورے پانچ سو اسٹیل کے آلو پکتے ہیں۔'' مستری فیض بخش نے اپنے علم اور معلومات کا بھرپور مظاہرہ کیا تو اس کے سامنے سے برتن اٹھاتی رحیما نے منہ بنا کر پہلے اسے گھورا اور پھر بولی۔

''فیض بخش! تیرا تعلق چک حکیمانوالہ سے ہے۔ یہ امریکہ کی باتیں کب سے کرنے لگا۔''

''یہاں میرا کیا پڑا ہے؟ تیری وجہ سے پندرہ دن بعد یہاں کی مٹی پھنکتا ہوں اور یہ آلو کی بھجیا اور تیرے چیکٹ کپڑوں کی بہار دیکھتا ہوں۔ سر سے پاؤں تک کڑوے تیل اور پسینے کی بدبو سونگھنے کے واسطے یہاں آتا ہوں اور وہ قصہ تو رہ گیا۔ کیا بتاتی ہے تو چھاتی میں درد

ہے۔ آج تو یہ کہانی تو نے ابھی تک نہیں سنائی۔'' فیض بخش نے کسی ناٹک کمپنی میں کام کرنے والے مسخرے کی طرح بھرپور اداکاری کی۔ رحیما کا تن من سلگ اٹھا۔ فیض بخش کی بے رحمی اور سفاکی کا تو اسے یقین تھا پر کمینگی کا تخم پہلی بار اس کے جسم سے پھوٹتا دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہے۔ قسم خدا کی شہر میں پریاں اترتی ہیں۔ ایسی پریاں جنہیں مردے دیکھ کر جی اٹھیں۔ ایک تو ہے جسے دیکھ کر متلی آتی ہے۔ اوپر سے تیرے نخرے۔'' وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ رحیما بھری بھری آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تیرا قصور نہیں ہے فیض بخش۔ میرے کرم ہی پھوٹے تھے۔''

''اس لئے تو کہتا ہوں کہ صبر شکر کر کے رہا کر۔ میرے آتے ساتھ ہی دکھڑے نہ لے کے بیٹھ جایا کر۔'' فیض بخش نے ایک لحہ ضائع کیے بغیر اسے سچ مچ کا قصوروار ٹھہرا دیا۔

''تو بتا کون سے عیش آرام ہیں اس کچی کوٹھڑی میں۔ جس بیماری کو تو میرا دکھڑا سمجھتا ہے وہ تیری وجہ سے ہوئی۔ پورا سال ہونے کو آیا تجھے درد بتاتے بتاتے۔ اب چبکے چلتے ہیں۔ ٹیسیں اٹھتی ہیں تو پندرہ دن بعد آ کر صرف سنتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔''

وہ بولتی چلی گئی اور وہ زہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''تو کیا کروں؟ ڈاکٹر بٹھا دوں۔ تیرے پاس ہے کیا؟ پندرہ دن بعد ایک رات کی خدمت تو نہیں کر سکتی تیری چھاتی کا درد میری وجہ سے ہے۔ تو انوکھی ہے اور کسی عورت کو تو میں نے روتے پیٹتے نہیں دیکھا۔''

''تجھے میرے درد سے نہیں اپنی مستی سے مطلب ہوتا ہے۔ کتنی بار کہا کہ شہر لے چل وہاں سرکاری ہسپتال ہوتے ہیں پر......''

''اچھا! بس بس شہر بہت مہنگے ہیں فیکٹری میں مستری ہوں میں کوئی فیکٹری کا مالک نہیں۔ اتا اتا علاج تو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ لا پیاز مجھے دے۔'' وہ اٹھا اور چولہے کے پاس بیٹھ کر ایک بڑی سی پیاز چھیلنے لگا۔ چھلکے کے بعد والی پرت اتار کر اس نے ٹیڑھے میڑھے کالے ٹین کے ڈبوں میں الٹے سیدھے ہاتھ مار کے ہلدی تلاش کر لی۔ چاروں انگلیوں کی مدد سے چٹکی بھری اور پیاز کی پرت پر پھیلا کر چمٹے سے چولہے کی گرم راکھ کرید کر چند دہکتے کوئلے نکالے۔ پیاز کی پرت ان پر اچھی طرح سینک کر بولا۔

''چل قمیص اوپر کر۔''

"یہاں صحن میں۔" وہ ہراساں سی اٹھ کر کمرے میں چل دی۔ فیض بخش پیاز گرم کوئلوں سمیت پلیٹ میں رکھ کر اس کے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ جونہی اس نے گرم پیاز اس کے سینے پر رکھی وہ درد سے تڑپنے لگی۔ چیخیں مارنے لگی مگر اس نے پروا نہیں کی۔ دوپٹے سے کس کے پیاز سینے پر باندھ دی۔ وہ تڑپتے تڑپتے ادھ موئی سی ہو گئی تب اسے چھوڑ کر وہ صحن میں بچھے پلنگ پر جا کر بے فکر ہو کے سو گیا۔

درد کی رات جیسے تیسے گزر گئی۔ نیم مردوں کی سی حالت میں اٹھ کر اس نے اس کے لئے ناشتہ بنایا۔ وہ پراٹھا اور چائے دیکھ کر بیزار سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو کر ناشتہ میں چلتا ہوں۔" اپنی پشاوری چپل پر اچھی طرح کپڑا مار کے اس نے پیروں میں ڈالی اور قمیص کا دامن جھٹک کے کالر کھڑا کر کے جانے کو تیار ہو گیا۔

"یہ پیاز......" وہ سینے پر بندھی پیاز پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"شام کو یہ نکال دینا۔ میری طرح دوسری باندھ لینا۔ ایک دو دن میں پھوڑا پھٹ جائے گا۔ وہ لاپروائی سے بولا تو وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔

"پھ' پھوڑا......" خشک لب پھڑ پھڑائے۔

"ہاں یہ پھوڑا ہی ہے۔ نرم پڑ گیا ہے۔ بس منہ بننے کی دیر ہے۔" اس وقت اس کی حیثیت کسی مستند جراح سے کم نہیں تھی۔

"فیض بخش! ایک پل میری آنکھ نہیں لگی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تو مجھے شہر لے چل وہاں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھا دے۔" اس کا سانولا رنگ منت کے زیر اثر پیلا پڑ گیا تھا۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں پیاز گرم کر کے بدلتی رہ۔"

"بخار سے میرا پنڈا جل رہا ہے۔ میری حالت پر رحم کھا۔" رحیما رو دی تو وہ بیدردی سے بنا کچھ کہے جیب میں سے کچھ ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر میں ایک چھوٹا سا تہہ شدہ کاغذ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو گامے کے پی سی او سے فون کرا دینا۔ آ کر دیکھوں گا۔"

"آ کر دیکھوں گا' کیا مطلب......؟"

"چھٹی ملنی مشکل ہوتی ہے۔ کوشش کروں گا۔ کوئی دوا دارو لے آؤں گا۔" وہ

سرسری انداز میں کہہ کر دو قدم دروازے کی طرف بڑھا تو وہ سامنے آ گئی۔

"فیض بخش! میں یہاں کلی ہوتی ہوں' کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر کیا کروں؟ وہ ہے نا تیری ماں اسے گاؤں سے بلا لے۔ یہ خرچہ بھی برداشت کر لوں گا۔" وہ حاتم طائی بن کر بولا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ درد سے بے حال چادر لپیٹ کے گھر سے باہر نکلی...... دروازے پر تالا لگا کر کھو کی طرف گئی۔ وہاں چاچا شیدا اپنا تانگہ لے کر نکلنے والا تھا۔ اسے دیکھ کر رک گیا۔ اس نے اپنی ماں کے لئے چاچے شیدے کو پیغام دیا کہ وہ فوراً اس کے پاس آ جائے۔ چاچے شیدے نے اسے پکا یقین دلایا کہ وہ پہلا کام ہی یہ کرے گا۔ جونہی چاچا تانگہ آگے نکال لے گیا وہ بھی لڑکھڑاتے قدموں گھر آ گئی۔ وہ پراٹھا جو اس نے فیض بخش کے لئے بنایا تھا اس کے دو تین نوالے پانی کے ساتھ حلق سے اتارے۔ درد کروٹیں لینے لگا تو وہیں پلنگ پر لیٹ گئی۔ اب اسے ماں کا انتظار تھا۔ کوئی دوسرا پرسان حال نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے گھر کے دائیں بائیں کھیت تھے۔ دور دور اکا دکا گھر تھے جن تک پہنچنے کے لئے راستے کے کھیت عبور کرنے پڑتے تھے۔ شدید گرمی میں ویسے بھی کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔ شام ڈھلے کوئی باہر آنے جانے والوں کا پتہ چلتا تھا ورنہ کچھ باہر کی آواز نہیں آتی تھی۔ فیض بخش اکیلا تھا۔ رشتہ طے کرتے وقت رحیما کی ماں حشمت بی بی کے لیے سب سے بڑی خوشی کی یہی بات تھی کہ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں۔ رحیما گھر پر راج کرے گی۔ اس وقت تو رحیما کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ ماں کو سمجھاتی رشتوں کی ضرورت اور فائدے بتاتی۔ یہ بات تو اسے خود کو بھی اس وقت پتہ چلی جب ڈولی سے اترتے ہی چولہا چوکی سنبھالنا پڑا۔ گھر میں نہ کوئی اس کی آمد پر دروازہ روک کے نیگ لینے والا تھا اور نہ کوئی گھونگھٹ اٹھا کر منہ دکھائی دینے والا۔ چند جان پہچان والے فیض بخش کے ساتھ برات میں آئے تھے پھر واپسی پر باہر سے ہی رخصت ہو گئے۔

فیض بخش نے پہلی رات ہی اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ اس چھوٹے سے کچے گھر میں رہنے والے فیض بخش کا دل محبت کا گہوارہ ہے۔ اس گھر میں نہ اور کوئی رشتہ ہے اور نہ اس گھر کے علاوہ کوئی زمین جائیداد ہے۔ مستری باپ کا مستری بیٹا ہوں۔ شہر میں توے بنانے کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور بس۔" یہ سن کر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ تب اسے بھرپور پیار دیتے ہوئے وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں کبھی تنہا نہیں

ہونے دوں گا......'' مگر ہفتے بعد جب اس نے شہر کے لئے بیگ تیار کیا تو وہ تنہائی کے احساس سے رو پڑی۔

''رحیما ! میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ مجبوری ہے۔ گھر میں صابن' سوڈا' مرچ مصالحہ سب ڈلوا دیا ہے۔ میں پندرہ دن کے بعد صرف دو دن کے لیے آیا کروں گا۔ میں نے لالو کو کہہ دیا ہے۔ سبزی کی ریڑھی بھی لے کر دروازے پر آ جایا کرے گا جو دل چاہے لے لیا کرنا۔'' وہ اپنی روانی میں بولتا چلا گیا۔ تب پہلی بار وہ سسکیاں لینے لگی۔

''تیری محبت ! تیرا احساس بھی کسی ریڑھی یا کسی ہٹی سے مل جائے گا کیا......؟'' وہ اس کے احساس پر قربان ہو گیا۔ گلے سے لگا کر خوب پیار کیا اور جھوم کر بولا۔ ''یہ انمول ہے۔ میرے پاس ہے جب آؤں گا تجھ پر لٹاؤں گا۔'' رحیما کے انگ انگ میں فیض بخش کے لفظوں کا نشہ اتر گیا۔ اس نشے میں وہ چور چور پندرہ دن گزارتی کہ فیض بخش آ جاتا۔ وہ دو دن عید اور راتیں شب برات بن جاتیں۔ فیض بخش کی محبت میں اتنی شدت ہوتی تھی کہ اس کے جانے کے بعد اگلے دو دن وہ تھکن سے چور بستر پر پڑی رہتی۔ ایسا دو تین سال ہوتا رہا پھر فیض بخش نے اس کی خالی گود پر تبصرہ کیا اور اپنے ایک ہونے کا احساس دلایا۔ وہ بے بسی سے اس وقت بھی صرف رو دی تھی مگر پھر فیض بخش نے اس طرف سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پھر اس کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ اس تبدیلی کے باعث رحیما کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی طرف سے بھی مکمل غافل ہوتی چلی گئی۔ ٹھیک سے کھانا پینا تک چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا گندمی رنگ جل جل کر سیاہ ہو گیا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ ایسے میں صرف سینے کا گداز اور ابھار ہی برقرار تھا جسے فیض بخش اپنی طاقت کے مطابق محسوس کر کے اکثر تعریف کر دیتا۔ لیکن پھر پچھلے سال تو اس کی تعریف پر وہ درد سے سی سی کرتی دور ہو جاتی۔ یہ درد بڑھتا گیا اور فیض بخش دور بہت دور ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے آنے میں وہ گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ اکھڑی اکھڑی باتیں کر کے چلا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج وہ کہہ کر گیا تھا۔ اس سے اس کے درد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ بار بار بھر آنے والی آنکھیں سخت ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ہلنے کی کوشش کے باوجود ہل نہ سکی۔ بڑی مشکل سے آواز نکالی۔

''کون......؟''

''رحیما ! دروازہ کھول......'' بے بے کی آواز آئی تو اس کی آنکھوں میں چمک آ

گئی۔

''آئی بے بی......'' وہ ہمت کر کے اٹھی۔ لڑکھڑاتے پیروں میں چپل پہننے کی کوشش کی۔ ایک چپل پہنی گئی اسی طرح دروازہ کھولا اور بے بے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے......؟'' بے بے نے کپڑوں کی پوٹلی پلنگ پر رکھتے ہوئے دکھ بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ ان کے کندھے سے جھول رہی تھی۔

''بے بے! یہ درد میری جان لے لے گا۔''

''ابھی کلموہا درد ٹھیک نہیں ہوا کیا......؟''

''درد تو علاج سے ٹھیک ہوتا ہے۔''

''تو' تو نے ابھی تک علاج نہیں کیا۔'' بے بے نے حیرت سے اسے سیدھا کر کے پوچھا۔

''فیض بخش کہتا ہے کہ یہ پھوڑا ہے منہ بن کر پھٹے گا تو سکون آئے گا۔''

''دکھا مجھے دکھا۔'' بے بے نے دائیں طرف سے اس کی قمیص اوپر سرکائی تو وہ درد سے تڑپنے لگی۔ بے بے کمزور بینائی کے باوجود ٹٹول ٹٹول کر پھوڑے کا منہ تلاش کرنے لگیں جب کچھ نہ نظر آیا تو فیض بخش کو کوسنے پیٹنے دینے لگی۔

''بخار سے بھٹی کی طرح بدن جل رہا تھا۔ سب پیلا ہی پیلا ہو گیا تھا۔ پھوڑا بھی ہے تو بھڑوی کا جام کسی جراح کو دکھاتا۔ نازک جگہ درد کے حوالے کر کے کیسے چلا گیا؟ اپنی عورت کی چادر بنتا' کیا اس گاؤں میں کوئی جراح نہیں۔ پر اس بے غیرت کی نسل ہی حرامی ہے۔ بدلے بدلے لچھن ہیں۔ تو جانے موت کا انتظار کر رہی ہے۔ خود دہلیز سے پاؤں نکال لیتی۔ ڈھونڈ لیتی کوئی اتہ پتہ۔'' بے بے بیٹی کی تکلیف دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ وہ بے بے کی سب باتیں سن کر بھی چپ رہی۔

''تجھے خماری ہے کہ تیرا مرد تیرے پاس ہے' ایسا نہیں ہوتا۔ یہ نکاح کے بولوں میں سر کے بالوں سے لے کر پیر کے ناخنوں تک کا سودا ہوتا ہے۔ تو نے جو درد کلیجے سے لگا رکھا ہے وہ تیرے پاس ہی رہ جائے گا۔'' بے بے نے مرد کی حقیقت اپنے تجربے اور مشاہدے کی ترازو پر تول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ جس خوف کی چڑیا کے پر مضبوطی سے پکڑے بیٹھی

تھی۔ ایک دم اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ بے بے کی باتیں اور فیض بخش کی باتیں ایک دوسرے کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوں۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ بے بے کا ہاتھ ہاتھوں میں دبا کر وہ خود کو سہارا دینے لگی۔

''اب تو ہمت سے کام لے۔ رات سر پر آ گئی ہے میں باہر جا کے کسی جراح کا پتہ کروں۔''

''بے بے! سویرے پتہ کریو۔ باہر اندھیرا پھیل گیا ہے۔ تجھے نہ رستے کا پتہ ہے اور نہ جراح کا۔ دکھائی بھی کم دیتا ہے۔''

''پر میرا بچہ! اس حالت میں تنور کی طرح جلتے ہوئے رات کیسے گزارے گی؟''

''جیسے گزار رہی ہوں۔'' وہ درد سے مسکرائی۔

''دل تو چاہ رہا ہے مردود سامنے آ جائے تو اس کا گریبان پکڑ کے پوچھوں کہ اے حرامی تخم! تجھے اپنے مزے سے مطلب تھا۔ درد کا علاج محلے والے کراتے۔ کیا سوچ کے کلی کو چھوڑ رکھا تھا۔''

''چھوڑ بے بے! اس کی بھی شہر میں نوکری کی مجبوری ہے۔'' رحیما نے شوہر کی حمایت کی۔

''کوئی مجبوری وجبوری نہیں ہوتی مرد ذات کی۔ تجھے اس کا اعتبار ہوگا مجھے تو اس دن سے شدید نفرت ہے جس دن تجھے کہہ کر مجھے گھر سے جانے کو کہا تھا۔ میں تیری بیماری کا سن کر چلی آئی۔''

''بے بے! تو نے اچھا کیا۔ ورنہ میں کلی مر جاتی۔'' وہ سسکاری بھر کے بولی۔ تو بے بے نے اسے آغوش میں بھر کے ہر درد سے جیسے آزاد کر دیا۔ کچھ دیر میں وہ سو گئی۔ کئی راتوں کی جاگی تھی ماں کی ممتا بھری گود میں سر رکھتے ہی نیند آ گئی۔ مگر رات کے آخری پہر وہ بری طرح تڑپنے لگی۔ پوری چارپائی پر لوٹنیاں کھانے لگی۔ درد جاگ اٹھا تھا۔ بے بے! بے بے! چبکے چل رہے ہیں۔ ہائے! میں مری' ہائے اللہ جی! وہ بلبلا رہی تھی۔ بے بے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔ بوڑھے کمزور جسم میں بیٹی کی تکلیف سے لڑنے کی قوت کہاں تھی۔ باہر رات کا اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ ایسے میں صرف اس کی دردبھری آواز چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ بے بے نے اٹھ کر کمرے میں' صحن میں' چولہے کے پاس

جلدی جلدی ہاتھ مارے کہ کوئی علاج اس وقت مل جائے مگر اس گھر میں رحیما کے علاوہ کوئی چیز قابل توجہ نہیں تھی۔ اس کی خستہ حالی دیکھتے ہوئے گھر میں کسی چیز کا ہونے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بے بے بے دم سی ہو کر اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔ ممتا بھری انگلیوں نے پھر کچھ دیر کو سکون اس کے جسم میں ڈال دیا۔ ٹھیک فجر کا وقت تھا جب وہ پھر سو گئی۔ بے بے نے بھیگی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں اور نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

قدرت کو رحیما پر رحم آ گیا۔ چاچا شیدا تانگہ لئے اس غرض سے آ نکلا کہ شاید حشمت بی بی نے واپس گاؤں جانا ہو مگر بے بے نے رحیما کی خراب حالت کا بتایا تو وہ جلدی سے بولا۔

''نمبردار صاحب کے گھر نکی بی بی کی سہیلی شہر سے آئی ہیں۔ وڈی ڈاکٹرنی ہیں۔ میں ٹیشن سے لا رہا تھا کہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے فوراً کالے بکسے میں سے دوا نکال کر دی۔ یہ رات کی بات ہے۔ تو کہے تو رحیما کو نمبردار صاحب کی حویلی لے چلیں۔''

بے بے نے اس مدد کو قدرت کا معجزہ جانا۔ جھٹ رحیما کو اٹھایا۔ اسے چادر میں لپٹا اور چاچے شیدے کی مدد سے جیسے تیسے کر کے تانگے میں بٹھایا۔ سارے راستے رحیما نے تنگی اٹھائی۔ تانگے کے ہلکے سے جھٹکے سے بلبلاتی رہی جبکہ چاچا شیدا ڈاکٹرنی کی اچھی عادت اور اچھی زبان کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرتا رہا۔ بے بے درمیان میں اٹک رہی تھی۔ کبھی بیٹی کو گلے سے لگا لیتی اور کبھی چاچے کی ہاں میں ہلا ملانے لگتی۔ چاچے شیدے نے ڈاکٹر صاحبہ کی ٹھیک تعریف کی تھی۔ وہ ناشتہ چھوڑ کر رحیما پر جھک گئی۔ ایسے میں ناشتے کی میز پر موجود نمبردار صاحب اور نمبردارانی صاحبہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آ گئے البتہ نکی بی بی اپنی سہیلی ڈاکٹر شائستہ کے ساتھ خوشدلی اور ہمدردی بھرے انداز میں معاون بن گئی۔ ڈاکٹر شائستہ نے رحیما کو چیک کرتے ہی فوراً شہر کے بڑے ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے بڑی سختی سے بے بے کی بات مسترد کر دی کہ رحیما کو پھوڑا نہیں نکل رہا بلکہ یہ کینسر کی علامت ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال نہ لے جایا گیا تو رحیما کی جان چلی جائے گی۔'' حشمت بی بی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ دہائی دینے لگی۔ تب نمبردار کے دل میں اللہ نے رحم ڈال دیا۔ انہوں نے اپنی جیپ پر ڈاکٹر شائستہ اور حشمت بی بی سمیت رحیما کو شہر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

شہر کی جیتی جاگتی دنیا میں رحیما نے موت سے بھرپور جنگ لڑنے کے بعد آنکھیں

کھولیں تو فوراً ہی یہ جان لیا کہ زندگی کے بدلے موت سے کس چیز کا سودا کرنا پڑا۔ اس نے ڈبڈباتی نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی زندگی بچانے کے لئے ڈاکٹرز نے فوری طور پر دونوں چھاتیوں کو کاٹنے کا فیصلہ کیا کیونکہ کینسر دائیں طرف والی چھاتی کو نقصان پہنچانے کے بعد بائیں طرف بھی پھیل چکا تھا۔ ڈاکٹرز کے نزدیک تو ایسے خراب حالات میں اس کا زندہ بچ جانا بھی حیران کن تھا۔ ڈاکٹرز اور نرسیں اسے اور بے بے کو مبارکبادیں دے رہے تھے جبکہ وہ بڑے ڈاکٹر کے اس جملے کی گرفت میں بند پلکوں سے آنسو بہا رہی تھی۔

''بی بی! مجبوری تھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔''

''ضابطے کے مطابق ہمیں آپ کے شوہر سے اجازت لینی تھی۔ لیکن سیریس کنڈیشن کی وجہ سے ہم اس کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔'' ڈاکٹر شائستہ نے ٹشو پیپر سے اس کی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے سمجھایا۔ اور وہ سمجھ گئی۔ اس کے بعد کسی نے اسے روتے نہیں دیکھا۔ ڈھیر ساری دوائیوں اور نصیحتی مشوروں کے ہمراہ وہ واپس گھر آ گئی۔ تب بھی بے بے کوشش کے باوجود اسے روتا ہوا نہ دیکھ سکیں۔ ان کے لئے یہ بھی پریشانی کی بات تھی۔ وہ چپ چاپ کمرے کی چھت گھورتی رہتی۔ چھت کی کڑیوں کا جائزہ لیتی رہتی۔ جب کبھی کوئی چھپکلی نظر آتی تو اس کی ساری توجہ اس طرف چلی جاتی۔ کینسر کی دوائیوں نے ویسے بھی اسے بظاہر اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سر کے بال اتر گئے تھے۔ ہاتھ پیروں کے ناخن نیلے پڑ گئے تھے۔ اس پر وقفے وقفے سے شعاعیں لگوانے کے لئے شہر جانا اور پھر واپس آنا سخت تکلیف دہ کام تھا۔ وہ اپنی مرضی سے تو شاید اپنی اتنی پروانہ کرتی بے بے نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

''حیاتی اس مرن جوگے کی وجہ سے ضائع نہ کر۔ اسے تیری ضرورت اب نہیں ہوگی' پر مجھے ہے۔ ابھی اللہ مدد کر رہا ہے کونسا دوا دارو پر پیسے خرچ ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹرنی نے' نکی بی بی نے سب بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ ٹھیک ہو کے ان کے بھلے کا بدلہ دینا۔ اس کی خاطر نہ جی جو تجھے اس مشکل میں اک واری ملنے نہیں آیا۔''

بے بے کی باتیں اس پر اثر کرتی تھیں۔ وہ فقط کروٹ لیتے ہوئے اتنا بولی۔

''یہ کیا کم ہے کہ اس نے دو ہزار روپے بھیج دیئے۔''

''بڑا تیر مارا۔ کم ذات نے تیرے کفن دفن کے لئے بھیجے تھے۔ تو زندہ بچ گئی یہ اس کے لئے برا ہوا۔''

''چھوڑ بے بے! رحیما کی تقدیر کی سختی ہے۔ مجھے اب فیض بخش کا انتظار بھی نہیں رہا۔''

''اچھی بات ہے۔ تو ذرا اور سنبھل جائے تو میں تجھے یہاں سے لے جاؤں گی۔''

''نہیں میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' اس کے بیمار تن میں ضد کی حرارت پیدا ہو گئی۔

''باؤلی نہ بن تو نہیں جائے گی وہ خود تجھے نکال دے گا۔''

''کچھ کہہ کر تو نکالے گا۔''

''چل ٹھیک ہے تو کر لے اس کا انتظار میں کل صبح سویرے گاؤں جاؤں گی۔ ساون لگ گیا۔ ریشماں کو اور اس کے پوتے کو گھر میں چھوڑ کے آئی تھی۔ بارش کا پانی چھتوں سے ٹپک رہا ہوگا۔ وہ دونوں پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ذرا دیکھ بھال کر کے پھر آ جاؤں گی۔ میرا تو دل ہے تو میرے ساتھ چلے۔''

''نہیں تو جا۔ فیض بخش آ نکلا تو بڑبڑائے گا۔''

''تیرا تو دماغ خراب ہے جو پریشن کرانے نہیں آیا۔ مہینہ ہونے کو آیا اب کیا کرنے آئے گا۔''

''دیکھا جائے گا۔ تو مجھے دلیہ گرم کر دے۔ خالی پیٹ میں آگ لگی ہے۔'' وہ بات کا رخ ہی بدل کر بولی۔ بے بے فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ تب اس نے آنکھوں سے باہر نکل آنے والا پانی ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کیا اور بے خیالی میں وہی ہاتھ سینے پر رکھا تو احساس محرومی کا اذیت ناک کرب دوبارہ پلکیں بھگو گیا۔ سکڑی ہوئی کھال اور کھال کے نیچے کا خلا چھوتے ہی جانے اسے کیا ہوا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹنے لگی۔ بے بے الٹے قدموں اندر آ گئیں تو وہ بین کرنے لگی۔

''بے بے! میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ کچھ نہیں بچا۔ میری عزت کی یہی پونجی تھی فیض بخش کیلئے۔ یہ بھی چھن گئی۔ اس کے میرے درمیان رہنے کو کچھ نہیں بچا۔ سب چوری ہو گیا۔ وہ روتے روتے بے حال ہو گئی۔ بے بے کے پاس اس کے درد کا درماں کہاں تھا؟ وہ اس کا سر گود میں رکھ کر خود ممتا کے آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔

''رحیما! تری زندگی قیمتی ہے۔ تیرا زندہ بچ جانا ہی میرے لئے کافی ہے۔''

"بے بے! مرد کے لئے عورت کی قیمت کیا ہے یہ بتا......؟"

"کم ذات مرد کے لئے نہ چھاتی والی عورت کی کوئی قیمت ہوتی اور نہ تیرے جیسی کی۔ تو خود سوچ یہ روگ بھی تو فیض بخش کی ناقدری سے بڑھا۔ ورنہ کیا پہلے دن سے تو یہ درد ساتھ لائی تھی۔ مرد کی غرض کے سو روپ ہوتے ہیں۔ یہ عورت سے کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اس لئے بھول جا کہ تو فیض بخش کے قابل نہیں رہی۔ تو پہلے بھی تو معمولی سی قابلیت کی مالکن تھی اور تیرے پاس کیا تھا۔ دنیا سے انوکھا روپ سروپ' سونا موتی' زمین مربعے' والی وارث' کیا تھا ترے پاس کچھ بھی نہیں۔ دواڑھائی چھٹانک گوشت کی اتنی بڑی قیمت نہیں ہوتی کہ ساری عمر اس پر گزر جائے۔ قیمت تو عورت کی تب بھی نہیں ہوتی جب وہ اپنے بدن پر مرد کا بوجھ اٹھائے نو مہینے دوسرے کی زندگی جیتی ہے۔ تجھے اس درد کا اندازہ ہی نہیں جو بچہ جنتے وقت وہ سہتی ہے۔ تو نے درد سہا ہے۔ اپنی جان پر جھیلا ہے مگر یہ مت سوچ کہ تو نے سب کچھ گنوا دیا۔ کچھ نہیں گنوایا۔ مرد اور عورت کے کھیل میں عورت کو بچانا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو پہلے جیسی ہے۔ بالکل پہلے جیسی۔" بے بے کے اندر سے جوالا مکھی پھوٹ نکلا تھا۔ رحیما نے ان کا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر پھیرا اور چلائی۔

"دیکھ! پہلے جیسی ہوں' کیا پہلے ایسی تھی......؟"

"تو نہیں سمجھے گی۔ تیری سمجھ ہی اتنی ہے۔"

"ہاں رحیما! پاگل ہے۔ تری بیٹی پاگل ہوگئی ہے۔ فیض بخش آئے گا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے گھر سے نکال دے گا۔"

"تو تو سامان باندھ لے۔ بالکل ایسا ہی کرے گا وہ۔ میرے ساتھ چل۔"

"نہیں جب وہ ایسا کرے گا تو اور بات ہوگی۔"

"تیری مرضی ہے۔ پر میں تجھے کلے چھوڑ کر کیسے جاؤں؟"

"تو نہ جا کچھ دن بعد چلی جائیو۔"

"ادھر بارش سے چھتیں ٹپک رہی ہیں۔" بے بے بیچارگی سے بولیں۔

"میرا تو گھر ہی گرنے والا ہے۔" دھیرے سے کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس دن کے بعد سے بے بے نے کچھ دنوں تک کے لئے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ رحیما کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوائیں دینے ہسپتال لانے لے جانے کے چکر میں دو

مہینے گزر گئے۔ جس روز ڈاکٹر نے ٹانکے کاٹے اور نسخہ لکھ کر دیا اس دن بے بے کی جان میں جان آئی۔ رحیما کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال پھر سے نکلنے لگے تھے۔ کمزوری اور نقاہت میں قدرے اضافہ ہوا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹرز کے حسب ہدایت اسے اچھی خوراک میسر نہیں تھی۔ اب تو یہ صورتحال تھی کہ ایک ایک پیسہ ختم ہوگیا تھا۔ گھر میں مرچ مصالحے' دال چینی کوئی بھی چیز باقی نہیں تھی۔ بس لالو ریڑھی سے سبزی دے جاتا جسے پکانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی وہ نہ ہونے کی وجہ سے ابلی ہوئی کچی پکی سبزیاں کھانے سے وہ عاجز آ گئی تھی۔

فیض بخش کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کئی بار جا جا کر اس کو فون کرنے کی کوشش کی مگر کسی بار بھی اس سے بات نہ ہو سکی۔ اب تو امید ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر خوفزدہ تھی۔ بے بے سے ہر بات چھپا کر اپنے آپ سے جنگ لڑ رہی تھی۔ بے بے کے لئے بیٹی کی یہ حالت اذیت کا باعث تھی۔ بھوک اور فاقے کے ساتھ غم برداشت کرنا رحیما کی ہمت کا کام تھا۔ انہوں نے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ روپے پیسے کا بندوبست کر کے لاسکیں۔

تب رحیما نے اپنا ایک چاندی کا سیٹ اور سونے کی انگوٹھی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے۔

"یہ کیا کروں......؟"

"بازار میں سنارے کی ہٹی ہے بیچ آ......"

"یہ کتنے کی بیچ آؤں گی۔ کوڑیوں کے بھاؤ لے گا۔"

"اور تو کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی جگہ بے بے نے پوچھا۔

"کون ہے......؟"

"حشمت بی بی! میں ہوں چاچا شیدا۔"

"اچھا اچھا آ جا اندر آ جا۔"

"کیا حال ہے رحیما بیٹی......؟" چاچے شیدے نے پوچھا۔

"زندہ ہوں چاچا۔"

"اوئے اللہ تجھے حیاتی دے۔"

"کیسے آنا ہوا......؟" بے بے نے پوچھا۔

"اک تو رحیما پتر کی خیریت پوچھنی تھی۔ دوسرا میں گاؤں گیا تھا۔ ریشماں کا پوتا بہت

سکھت بیمار ہے۔ وہ اسے شہر لے جانا چاہتی ہے۔ تجھے بلا رہی ہے کہ آ کے گھر بار سامبھ لے۔ پر رحیما پتری کی حالت تو ابھی چنگی نہیں لگتی۔'' چاچے شیدے نے رحیما کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا۔

''رشید بھائی! بس اسی کرماں ماری کی فکر ہے۔ یہ کلی ہے کوئی دوا دارو دینے والا بھی نہیں۔فیض بخش کی کوئی خیر خبر نہیں۔ پریشن کی اطلاع ملنے پر بھی وہ نہیں آیا۔ آ جاتا تو میں بے فکر ہو کے چلی جاتی۔'' بے بے کے کہنے پر چاچے شیدے نے ایک لمبی سانس بھری اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''حشمت بی بی! تو سیانی بیانی ہو کر بھی پانی تے لکیراں لا رہی ایں' ہن تیکر انداجا نہیں ہویا۔''

''تیری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے پر اس کا کیا کروں جو یہیں رہ کر مرنا چاہتی ہے۔'' بے بے نے دکھی لہجے میں اپنی بے بسی بیان کی تو چاچے شیدے نے براہ راست رحیما سے کہا۔

''دھی رانی! سن گور نال سن۔ میرا ابا حمید کوچوان عمر بھر تانگہ چلاتا رہا۔ کچے پکے رستوں پر اپنی جوانی کی زکوٰۃ نکالتا رہا جب بڈھا ہو گیا تو اس نے مجھے تانگہ گھوڑا حوالے کرنا چاہا' میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں اور میری ماں چاہتے تھے کہ تانگہ گھوڑا ویچ کے دو تین مجھیں (بھینسیں) رکھ لیں۔ ابے کو ہماری بات پسند نہ آئی۔ وہ کھوب ہنسا اور پھر آنکھوں میں آیا پانی اپنے صافے سے پونچھ کر بولا۔

''اوئے شیدے یار! تو کیا جانے گھوڑے کا مل۔ اوئے اخیر عمر تک نفع دیتا ہے اور مجھ کٹھے دی ہووے' کسی نسل دی ہووے' اس کا مل اس کے گیا بن ہونے اور تھنوں میں دودھ آنے تیکر ہوتا ہے۔ جے دونوں چیزیں کھتم تو وہ بھی کھتم صرف فیر قصائی کول وکدی اے۔''
چاچے شیدے نے باپ کے الفاظ دہرا کر کچھ دیر رحیما کو دیکھا وہ ویران آنکھوں سے انہیں دیکھتی ہوئی اٹھ کر کمرے میں چلی گئی کچھ دیر بعد باہر آئی تو کپڑوں کی پوٹلی اس کے سینے سے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر اضراب ہی اضطراب تھا۔
''بے بے! چل اٹھ چلیں' کہیں فیض بخش نہ آ جائے۔''



ضمانت

چوتھی بار گود جھاڑ کے خالی خالی نظروں سے اس نے اپنا جائزہ لیا۔ وہ پہلے والی شاہ بانو بن چکی تھی۔ دھان پان سی شاہ بانو۔ جس کی کمر لچکتی تھی، بدن چلنے سے شاخوں کی مانند ڈولتا تھا۔ اس نے بجھے بجھے دل سے، سرد ٹھٹھرتے ہاتھوں سے کمر اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور پھر سسکی بھر کے بستر پر گر گئی۔ اس کی تو ہمت جواب دے گئی تھی۔ حالانکہ مراد علی کا سامنا کرنے کیلئے اسے چٹانوں جیسی سختی چاہیے تھی۔ پہاڑوں جیسی بلندی چاہیے تھی۔ مگر لگتا تھا کہ آج تو پورا وجود سرد گیلی ریت میں ڈھل گیا تھا۔ جبکہ پہلی بار تو اس کی گود خالی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی تین بار مراد علی کے وارث اسکی کوکھ سے مردہ پیدا ہوئے تھے۔ ہر بار وہ اس کرب سے گزرتی تھی۔ مراد علی نے تو کبھی ایک جملہ اسے اولاد کی محرومی کا نہیں کہا تھا۔ ان کے نزدیک تو مردہ بچے کے جنم کی روح فرسا خبر ایک غیر اہم معمولی سی خبر ہوتی تھی۔ پچھلی مرتبہ تیسری مردہ بچی کی خبر اس نے خود فون پر دی تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''شاہ بانو! تم بھی کمال کرتی ہو۔ کوئی اہم بات نہیں۔ آج دائی رحمت کی بھینس نے بھی مردہ بچھڑا پیدا کیا ہے۔'' شاہ بانو کی سماعت پر گویا بارودی سرنگیں پھوٹ گئیں۔ اس کے بچے اور بھینس کے بچھڑے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ سناٹے میں آ گئی تو وہ پھر بولے۔ ''جب سوا مہینہ نہا لو تو اطلاع کر دینا۔'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی فون بند ہو گیا۔ شاہ بانو کو بھاگ بھری نے سہارا دیکر بستر پر لٹا دیا۔
''بی بی! کیوں فکر مند ہوتی ہو۔ جب صاحب کو غم نہیں تو آپ کیوں غم کرتی ہو؟۔''
''بھاگ بھری! یہی تو غم ہے کہ مراد علی میرے غم میں بھی شریک نہیں۔''

''بی بی! اولاد مرد کی قسمت کی ہوتی ہے۔ صاحب کو فرق نہیں پڑتا تو......''

''مجھے فرق پڑتا ہے۔ وہ تو رات دن محفل میں ہوتے ہیں۔ مجھے یہ تنہائی ان کی وجہ سے مل رہی ہے۔'' وہ ایکدم چلائی۔

''بی بی! کیا فائدہ اس آواز کا۔ وہ تو مہینوں حویلی نہیں آتے۔''

بھاگ بھری کی بات نے اسے گھائل کر دیا۔ آنکھوں سے اشک بہتے رہے اور وہ ساری رات اللہ سے شکوے شکایت کرتی رہی۔

صبح بھاگ بھری نے اسے دھیرے سے ہلا کر مراد علی کے آنے کی اطلاع دی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس سے مراد علی کے استقبال کیلئے اٹھا نہ گیا۔ تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ مراد علی نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور خمار آلود سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تمہارے مردہ بچے کی رات مجھے اطلاع مل گئی تھی۔ پر وہ کیا ہے کہ تا الیکشن سر پر کھڑے ہیں۔ بہت سے دوست یار جمع ہو گئے تھے۔'' سرسری انداز میں لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ انہوں نے اسے بتایا تو وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''میرے مردہ بچے کی اطلاع تھی اور تمہارا کیا تعلق تھا اس سے؟''

''او بابا! زندہ بچہ ہوگا تو میرا کہلائے گا۔ مردہ بچے سے میرا کیا رشتہ ناطہ؟ جس دن زندہ بچے کو جنم دو اس دن دیکھنا کہ مراد علی کیسا جشن مناتا ہے۔'' وہ لاپروائی سے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولے۔

''مردہ بچے کونسی ماں پیدا کرنا چاہتی ہے؟ میں کس کرب سے گزرتی ہوں یہ آپ کیا جانیں؟''

''شاہ بانو! میں نے کبھی کچھ کہا بابا! اتنی دولت ہے کہ تم بچوں کی پیدائش پر خرچ کرتی رہو، میں نے تمہیں کبھی طعنہ نہیں دیا۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ بیوی اور بچے کی آپ کو ضرورت نہیں۔ آپ کی ہر ضرورت تو پیسے سے پوری ہو جاتی ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''چھوٹے سے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ شاباش میرا ضروری سامان پیک کرا دو مجھے لاہور جانا ہے۔'' انہوں نے کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

شاہ بانو کیلئے یہ بھی معمول کی بات تھی۔ مراد علی ایک آدھی رات کے سوا کب اس

کے پاس رہتے تھے۔ ان کی تو جابے جا مصروفیات سے وہ باخبر رہتی تھی۔ زمینوں پر، فارم ہاؤس پر، یا پھر ملتان میں بنائی گئی اس وسیع و عریض کوٹھی میں۔ جو بقول ان کے جنت ہے۔ اس جنت میں سوائے اس کے سب کچھ تھا۔ ہر درجے اور مرتبے کے دوست کی رہائش کا انتظام تھا۔ ہر ایک کی پسند اور ضرورت کے مطابق مہمان نوازی کا بندوبست ہوتا ہے۔ سیاسی اور غیر سیاسی دوستوں کے جمگھٹے میں وہ ہر غم اور فکر سے آزاد رہتے تھے۔ ان کے ہر فعل کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ ان کے آبائی گاؤں سے لیکر شہر تک لوگ ان کے بارے میں ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ مگر ان پر اس قسم کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ دو سال قبل رکن قومی اسمبلی بننے کی وجہ سے لوگ خائف ہو گئے۔ سب کو اپنی عزت اور جان پیاری تھی۔ یہاں تک کہ اس کا بھائی بھی کبھی مراد علی سے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا تھا کہ وہ اپنا روپیہ اور وقت کہاں ضائع کرتے ہیں۔ صرف بہن کے صبر اور خاموشی کی خاطر چپ سادھ رکھی تھی۔ مگر مراد علی اور ان کے بھتیجوں عنایت علی اور شرافت علی کا خیال تھا کہ وہ ان کی طاقت اور پہنچ سے ڈرتا ہے۔ کئی بار ان تینوں نے مل کر قہقہے لگاتے ہوئے اس بات کا برملا اظہار کیا۔ ایسے میں ہر بار شاہ بانو اس منظر سے ہٹ جاتی کیونکہ وہ ان بہکے ہوئے لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ عنایت علی اور شرافت علی تو مراد علی سے زیادہ سفاک اور بگڑے ہوئے انسان ہیں۔ مراد علی کو ان پر ناز ہے وہ ان کے کارنامے سینہ تان کر سنتا اور ہر قسم کے جرم میں ان کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ اس لیے اس نے کبھی مراد علی سے ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ گزشتہ سال ہی عنایت علی نے جب کپڑے دھوتی رانو کو بازو پکڑ کر کھنچا اور اس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو رانو کی چیخ و پکار پر وہ اپنے کمرے سے بنا سلیپر کے باہر نکلی۔ اس وقت عنایت علی نے ایک ہاتھ سے رانو کی کلائی پکڑی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کر کے قہقہے لگا رہا تھا۔

''عنایت علی!'' وہ کپکپاتی آواز میں چلائی۔

''کیا بات ہے چاچی؟'' وہ فطری اکھڑپن سے بولا۔

''چھوڑ دو اسے کیوں بدتمیزی کر رہے ہو؟''

''شاوا بھئی! معمولی سی نوکرانی کیلئے اتنا درد۔ چاچی! غور سے دیکھ یہ نوکرانی ہے۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

''عنایت علی! نوکرانی کی بھی عزت ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔

''بلے بھئی! ہماری چاچی نے نوکرانیوں کو بھی اپنی جگہ رکھا ہوا ہے۔''

وہ بھولی صورت بنا کر بولا اور جھٹکے سے رانو کو چھوڑ دیا۔ رانو سہم کر اس کے پیچھے چھپ گئی۔

''آئندہ خیال رکھنا۔''

''دیکھ چاچی! آج تو تیرے خیال سے میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ آئندہ یہ خیال رکھنا میرے اختیار میں نہیں۔'' وہ شان بے نیازی سے کہتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے رانو کی پیٹھ تھپتھپائی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کمرے میں آ کر اس بات کا ذکر اس نے خفگی سے مراد علی سے کیا تو وہ ہنس دیئے۔ وہ تلملا سی گئی۔

''آپ ہنس رہے ہیں۔''

''اوئے ہنسنے کی بات تو ہے۔ احمق نے تمہارے کہنے سے چھوڑ دیا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران رہ گئی۔

''او بابا! نوکرانیوں کیلئے پریشان نہ ہوا کرو۔'' وہ بال سنوارتے بولے۔

''آپ......؟''

''میں عنایت علی کے ساتھ گاؤں جا رہا ہوں۔'' اس کا جملہ یکسر نظر انداز کر کے وہ باہر نکل گئے۔ اور اس نے آنکھوں میں آئے بے بسی کے آنسو صاف کر کے خود کو بستر پر گرا لیا۔ اس کے علاوہ وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

وہ جانے اور کتنی دیر خیالوں میں گم رہتی کہ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز نے چونکا یا۔ ہارن پہچان کر وہ جلدی سے وارڈ روب کی طرف بڑھی۔ عنایت علی اور شرافت علی آ گئے تھے اور مراد علی نے ان کے ساتھ لاہور جانا تھا۔ وہ تیزی سے بیگ میں ضروری سامان رکھنے لگی اسی اثنا میں وہ دونوں اندر آ گئے۔

''سلام چاچی!''

''وعلیکم السلام۔'' بادل نخواستہ اس نے جواب دیا۔

''چاچی! اب کی بار بھی مردہ بچے کا سن کر بہت افسوس ہوا۔'' شراف علی نے رسماً جملہ ادا کیا۔ اس کے ہاتھ کانپے۔ چپ رہی۔

''چاچی! لگتا ہے تجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے جس کی وجہ سے زندہ بچہ نہیں ہو رہا۔''

عنایت علی نے لاپرواہی سے کہا تو وہ حیران پریشان سی اس کے بالکل سامنے آ گئی۔

''عنایت علی! کبھی کبھی انسان دوسروں کے گناہوں کی بھی سزا بھگتتا ہے۔''

''تیرا مطلب ہے کہ یہ کسی اور کے گناہ کی سزا ہے۔'' عنایت علی نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''اس کا جواب تو مجھ سے بہتر تمہارے پاس ہے۔

''اوئے عنایت علی! کن باتوں میں پڑ گئے ہو۔ چلنا نہیں ہے کیا؟

مراد علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلنے کیلئے ہی تو آئے ہیں۔'' شرافت علی نے کہا۔

''بھاگ بھری! مراد علی نے آواز دی۔

''جی!'' بھاگ بھری بوتل کے جن کی مانند حاضر ہوگئی۔

''سامان گاڑی میں رکھو اور ہاں کل بیگم صاحبہ کیلئے مولوی صاحب سے کوئی تعویذ وغیرہ لے آنا، کوئی توبہ تاب کا وظیفہ پوچھ آنا۔ شاید اس کو معافی مل جائے۔'' مراد علی نے خلاف توقع ایسی بات کہہ دی کہ وہ پتھرا گئی۔ چلا اٹھی۔

''مراد علی! میرے لیے تعویذ اور مجھے معافی مل جائے؟''

''اور کیسے زندہ بچہ پیدا کرتا ہے، بھئی عورت ہی بچہ جنم دیتی ہے اسے ہی معافی مانگنی چاہیے۔'' مراد علی نے کوٹ پہنتے ہوئے تحمل سے کہا۔

''واہ! بہت خوب!'' وہ روتے روتے ہنس دی۔

''چاچا! بیوی کو بالکل پڑھا لکھا نہیں ہونا چاہیے۔'' عنایت علی نے طنزیہ جملہ پھینکا۔

''اوئے تم چل کر گاڑی میں بیٹھو اور یہ بتاؤ سب سامان تو ساتھ لیا ہے نا۔''

مراد علی نے آنکھ دبا کر پوچھا۔

''اے ون سامان، بس چلنے والی کرو۔'' شرافت علی نے مسکرا کر کہا اور دونوں بھائی باہر نکل گئے۔

''شاہ بانو! مجھے لاہور ڈسٹرب نہ کرنا۔'' وہ تحکم سے کہہ کر چل دیئے، وہ صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔

''بی بی! گاڑی میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔'' بھاگ بھری نے قالین پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''سنا نہیں تم نے کہ سب گناہوں کی معافی مجھے مانگنی ہے۔''

''سچ تو یہ ہے کہ صاحب کے گناہوں کی سزا تم کاٹ رہی ہو۔'' بھاگ بھری دکھ سے بولی۔

''بھاگ بھری! کیوں نہ مراد علی کی دوسری شادی کردیں۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''اس گھر میں وارث آجائے گا۔ مراد علی لوٹ آئینگے۔''

''بی بی! صاحب کا مسئلہ وارث تو نہیں، وہ تو عیاشی کو اپنی ضرورت بنا چکے ہیں۔ ایک اور غریب کو مشکل میں نہ ڈالیں۔'' بھاگ بھری نے اپنی دانست میں اسے آگہی دی۔ مگر یہ بات تو وہ جانتی تھی پھر بھی ایسا سوچ رہی تھی۔

''ہوسکتا ہے کسی دوسری کے نصیب سے گھر کو وارث اور مراد علی کو ہدایت مل جائے۔ شاید میرے ہی کسی گناہ کی سزا مجھ مل رہی ہے۔''

''توبہ، توبہ بی بی! آپ تو اتنی اچھی ہیں۔۔'' بھاگ بھری نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''خطا اور گناہ کب کس سے ہوجائے یہ ہمیں کیا معلوم؟ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ مراد علی میرے کسی گناہ کی سزا میں، میرا مقدر بنے اور اب میں یہ سزا جزا میں بدلنا چاہتی ہوں، کسی نیک پارسا سی لڑکی کو مراد علی کی بیوی بنا کر لانا چاہتی ہوں۔''

''بی بی! آپ کی پارسائی کی گواہی تو سب دیتے ہیں پھر اور کونسی پارسا کی ضرورت ہے۔''

''بھاگ بھری! میں مراد علی کی بھلائی چاہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مراد علی کی ہدایت میں دوسری عورت کا حصہ لکھا ہو۔''

''بی بی! آپ کی آپ جانیں۔ ہم تو ٹھہرے جاہل۔ جو بھی کرنا خیال سے کرنا کہ

سوتن مٹی چون کی بھی بری ہوتی ہے۔''

''اللہ مالک ہے۔ پہلا مسئلہ تو مراد علی کو راضی کرنے کا ہے اور ذرا غور کر کوئی لڑکی ہے تیری نظر میں کیا؟'' اس نے کہا۔

''لڑکیاں تو بہت سی ہیں پر بی بی! آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے والی تو ڈھونڈنی پڑے گی۔''

تو ڈھونڈو بھاگ بھری! میں اس گھر میں ہنستی مسکراتی زندگی دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آس کے جگنو اتر آئے۔ بھاگ بھری حیران تھی، پریشان تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نازک سی بی بی کے بدن میں اتنا مضبوط دل محفوظ ہے۔

''اور صاحب کو کون راضی کرے گا؟''

''میں راضی کرلوں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ٹھیک ہے بی بی! میں دیکھتی ہوں علاقے میں کونسی لڑکی ملک صاحب کیلئے اچھی رہے گی۔'' بھاگ بھری نے کہا اور کام کاج سے لگ گئی۔ مگر شاہ بانو کو یہی خیال ستانے لگا کہ وہ ملک مراد علی کو کیسے راضی کرے گی؟ اور پھر اپنے بھائی کو کیا کہے گی کہ کیوں اپنے شوہر کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہوں؟ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ رات اس نے ملک مراد علی کے ملازم خاص طفیل محمد کو بلایا تو وہ دوڑا چلا آیا۔

''حکم بی بی سیب! (صاحب)'' وہ دروازے کے باہر ہی رک کر بولا۔

''طفیل محمد! ملک صاحب کا لاہور کتنے دن کا پروگرام ہے؟''

''اللہ جانے۔''

''لیکن تمہیں تو ان کے ہر پروگرام کی خبر ہوتی ہے۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''ہاں پر۔۔۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''پر کیا۔۔۔۔؟ طفیل محمد!'' اس نے کریدا۔

''شاید کچھ دن لگ ویسن۔''

''چلو خیر میں خود موبائل پر پوچھ لوں گی۔'' ایک دم ہی اس نے اپنی موجودگی کا احساس کر کے طفیل محمد کو بھی احساس دلانا چاہا۔

''ٹھیک ہے بی بی!'' وہ شاید بڑی عجلت میں تھا۔

پھر کئی دن ہمیشہ کی طرح بے کیف بے رنگ گزر گئے ۔ وہ تھی حویلی کا سناٹا تھا۔ ایک ایک کام بار بار کر کے بھی فرصت ختم نہیں ہوتی تھی ۔ آج تو کچھ زیادہ ہی ویرانی تھی۔ بھاگ بھری جو ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی وہ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ حویلی تو گاؤں سے باہر سڑک کے قریب تھی جبکہ گاؤں کے اندر بسنے والے لوگ ملک مراد علی، ملک عنایت علی اور ملک شرافت علی کے پیدائشی غلام تھے۔ جدی پشتی وہ ان کی زمینوں پر آباد تھے۔ بھاگ بھری کی ایک ہی بیٹی تھی جو شادی شدہ تھی۔ گاؤں کے اندر کچے پکے گھر میں آباد تھی۔ اس کا شوہر ملک عنایت علی کی حویلی میں چوکیدار تھا۔ بھاگ بھری بیٹی کو ملنے گئی تھی ۔ اس نے شام کو لوٹنا تھا۔ شاہ بانو اس کا انتظار کر رہی تھی ۔ مغرب کے بعد جونہی وہ آئی تو سیدھی اس کے کمرے میں آ گئی اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

''کیا بات ہے بھاگ بھری؟'' اس نے حیرت سے پوچھا

''خیریت نہیں ہے جی' بڑی بری خبر ہے۔''

''کیسی بری خبر؟''

''ملک شرافت علی کے ہاتھوں دینو ترکھان کی چھوکری چھیماں کا قتل ہو گیا ہے۔ ہوٹل سے پولیس ملک شرافت علی کو گرفتار کر کے لے گئی ہے اور ملک مراد علی اور عنایت علی کو بھی ساتھ لے گئی ہے ۔ وہ دوسری چھوکری بھاگ گئی ہے۔'' بھاگ بھری نے اس طرح ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا جیسے کئی دن کا پیاسا پانی کا کٹورا ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی جائے۔ شاہ بانو کا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رہ گیا۔

''تجھے کس نے بتایا؟''

وہ سب چپ ہیں، مگر ملک عنایت علی کی حویلی میں پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ دینو کی سسکیاں حویلی میں بند ہیں۔''

''ملک صاحب تو اس قصے میں شامل نہیں ہیں نا۔'' اس نے دل بہلانے کی غرض سے پوچھا

''سنا تو یہی ہے۔''

''ملک صاحب سے کیسے رابطہ کیا جائے۔''

''آپ نہ کریں، وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔''

''جانے کیا ہونے والا ہے؟''

''اللہ خیر کرے گا، ایک اور خبر بھی ہے۔''

''وہ کیا ہے۔''

''مولوی صاحب کی بیٹی ثریا بہت پیاری ہے ابھی تک اس کا کہیں رشتہ طے نہیں ہوا ہے۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''ان حالات میں تو کچھ بھی ممکن نہیں۔''

''یہ حالات تو گاؤں والے ہمیشہ سے دیکھتے چلے آرہے ہیں، میرا تو خیال ہے نیک، پانچ وقتوں کی نمازی لڑکی ہی ملک صاحب کیلئے بہتر رہے گی۔

''تو کیا میں پانچ وقت کی نمازی نہیں۔'' شاہ بانو نے پوچھا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ کھسیانی ہوگئی۔

''مولوی صاحب کو یہ بات کون کہے؟''

''کہنا کیا ہے، مولوی صاحب کو یہیں حویلی بلوا لیں۔''

''لیکن پہلے ملک صاحب سے بات کرنی ضروری ہے اگر انہوں نے بات نہ کی؟''

''اوں ہنہ! بی بی آپ مرد والی ہو کر بھی مرد کی فطرت سے واقف نہیں، ملک مراد صاحب جیسے مرد کسی بھی لڑکی اور عورت کیلئے انکار نہیں کرتے۔'' بھاگ بھری نے اس کی بات کاٹ کر بڑے تجربے کی مدد سے جم کے رائے دے ڈالی۔ شاہ بانو لاجواب ہوگئی۔

اس نے اسی وقت ملازم خاص ہدایت اللہ کو بلا کر مولوی صاحب کو پیغام پہنچانے کی تاکید کر دی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ ہدایت اللہ نے تذبذب کے عالم میں شاہ بانو کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی اور کہا کہ کل دن میں پیغام دے آنا۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بھاگ بھری کچھ دیر کیلئے باہر گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ شاہ بانو کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ مگر اسی اثنا میں گیٹ سے ملک مراد علی کی لینڈ کروزر داخل ہونے کی آواز پر وہ چونکی۔

''ملک مراد علی!''

وہ بڑبڑائی۔ اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے۔ بکھرے بکھرے بالوں کے ساتھ پریشان اور تھکے تھکے۔

''اللہ خیر! آپ آ گئے۔''

"ہاں! کچھ دیر کیلئے۔ جلدی سے کھانا یہیں منگواؤ۔" وہ تیزی سے کہہ کر فریش ہونے کیلئے واش روم میں گھس گئے اور وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ رانو اور بھاگ بھری کو جلدی سے کھانا لانے کا کہہ کر وہ واپس کمرے میں آئی تو ملک مراد علی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے۔ وہ ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"خیر تو ہے آپ پریشان ہیں۔"

"نہ...... نہیں کوئی پریشانی نہیں۔ اپنے شرافت علی پر قتل کا الزام لگا ہے۔" الزام کا لفظ ادا کر کے ملک مراد علی نے اسے یقین دلایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

"مگر...... بات تو کچھ اور مشہور ہے۔"

"باتوں کی پروا نہیں کرتے ہم۔ بڑا تگڑا وکیل کر کے آیا ہوں، میری چیک بک نکال کر دو پیسوں کی ضرورت ہے۔" ہمیشہ والا سرسری انداز تھا۔

"ملک مراد علی! دینو کی بیٹی وہاں لاہور کیسے گئی؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"اوئے! گاڑی میں گئی تھی۔"

"کیوں......؟؟" شاہ بانو کے خون میں دینو کی بیٹی کے وجود کی پکار گردش کرنے لگی۔

"شاہ بانو! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اور میں کہہ کر گیا تھا کہ کوئی تعویذ دھاگا کرا لینا۔ یہ بد بخت بھاگ بھری بھی کام چور ہو گئی ہے۔" وہ اس کا سوال یکسر نظر انداز کر کے بستر پر دراز ہو گئے۔

"ملک صاحب! اس گھر کو صرف آہوں سے بچا لیں۔" اس نے کھوئے کھوئے کہا۔

"او بچے ہیں بھول ہو گئی ہے، کوئی قیامت نہیں آ گئی، تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔"

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ بھی موضوع بدل کر بولی۔

"ہاں! بولو۔" وہ متوجہ ہوئے۔

"آپ دوسری شادی کر لیں۔"

"کیا؟ شادی میں کیا پڑا ہے؟" وہ ہنس دیئے۔

"شادی میں اس گھر کی رونق ہے' آبادی ہے' آپ کی واپسی ہے۔" وہ جلدی سے

بولی۔

"میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی۔"

"ملک صاحب! اس گھر کو وارث چاہئے۔ آپ اس گھر کیلئے دوسری شادی کر لیں اس طرح سب پریشانیاں ختم ہو جائینگی۔ بلائیں ٹل جائیں گی۔"

"کونسی پریشانیاں ہیں۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"بہت سی پریشانیاں صرف محسوس ہوتی ہیں، دکھائی نہیں دیتیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ حقیقی خوشیوں سے بھرا گھر اللہ کی رحمتوں سے بھر جائے۔ آپ اسے گھر سمجھ کر آئیں اور کہیں نہ جائیں۔"

ہا! ہا! ہا! سب کام کاج چھوڑ کے زنانیوں کے پلو سے بندھ جاؤں اور کس چیز کی کمی ہے اس گھر میں۔" ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

"آپ کچھ بھی کہیں، میری التجا ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ملک مراد علی نے حیرت سے دیکھا وہ سچ مچ ایسا چاہتی تھی۔

"او اچھا اچھا دیکھیں گے فی الحال تو صبح سویرے لاہور جانا ہے۔ شرافت علی کی ضمانت کرانی ہے پھر بات کریں گے۔" وہ کہہ کر کروٹ لیکر لیٹ گئے۔ اسے کچھ امید بندھ گئی تھی کہ ملک مراد علی کے فیصلے میں لچک کی گنجائش موجود ہے۔ انہیں راضی کیا جا سکتا ہے۔

اگلی صبح ملک مراد علی ناشتہ کر کے لاہور کیلئے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہدایت اللہ کو بھاگ بھری سے مولوی صاحب کے پاس جانے کا کہلوایا اور خود ہیٹر کے قریب بیٹھ کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بھاگ بھری نے اسے سوچوں میں گھرا دیکھ کر وارڈ روب کھول کے کپڑے سیٹ کرنے شروع کر دیئے۔ سردی پورے جوبن پر تھی۔ کمرے کے گرم ماحول میں سردی کی شدت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن ہدایت اللہ اور مولوی صاحب جب سردی سے کانپتے ہوئے آئے تو اس نے مولوی صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ہیٹر چلانے کو کہا۔ بھاگ بھری کو چائے لانے کا کہہ کر گرم پشمینہ کی شال کندھوں پر پھیلا کر خود ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ مولوی رحیم الدین حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے۔ سانسیں الجھن کا شکار تھیں۔ نہیں معلوم تھا کہ کونسا حکم ملے؟ یا کسی کردہ نا کردہ جرم کی سزا سننے کو ملے۔ شاہ بانو

نے شدید سرد ماحول میں بھی ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھے۔ شاہ بانو ان کی دلی کیفیت سے بخوبی واقف تھی۔ ان کی ہمت بندھانے کو بولی۔

''مولوی صاحب! اطمینان رکھیے ایسی کوئی بات نہیں جس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔

''جی ملکانی صاحبہ!''

''دراصل اس حویلی پر آزمائش کی گھڑی ہے، آپ کی مدد درکار ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں ملکانی جی!''

''مولوی جی! ملکانی جی کو آپ کی بیٹی ثریا کا رشتہ چاہیے۔'' چائے لے کر آتی بھاگ بھری نے کہہ دیا۔

''جی!'' مولوی صاحب کو جھٹکا سا لگا۔

''مولوی صاحب! ملک مراعلی کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

'جی! ملک مرادعلی کی دوسری شادی اور میری ثریا سے۔''

مولوی رحیم الدین کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔

''جی مولوی صاحب! ملک مرادعلی کی ویران حویلی کو آباد کرنے کیلئے ثریا چاہیے۔''

''ملکانی جی! آپ مالک ہو مختار ہو مگر ملک مرادعلی کو ثریا کیسے دی جا سکتی ہے، کون نہیں......؟''

''آپ جو کہنا چاہ رہے ہیں وہ میں جان چکی ہوں، دوسرے لفظوں میں، ملک صاحب سے ثریا کا رشتہ جہنم میں دھکیلنے کے برابر ہے۔ کیونکہ ملک مرادعلی کے بارے میں سب کچھ سارا گاؤں جانتا ہے۔ میں کوئی سفارش یا حمایت نہیں کروں گی۔'' وہ بڑے تحمل سے بولی۔

''ملکانی جی! آپ اس حویلی میں رہتے ہوئے بھی ایسا سوچ رہی ہیں۔''

''مؤذن کا کام ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ پر بلائے، ہدایت کے راستے پر آنے کی دعوت دے۔ یہ کام بہت لائق اجر ہے۔''۔ وہ بولی۔

''لیکن، سب مؤذن کی پکار سنتے تو نہیں ہیں۔''

''سنتے سب ہیں عمل چند ایک نہیں کرتے۔''

''ایسے میں میری ثریا کا مستقبل کیا ہوگا؟''

''آپ کو ہر طرح کی ضمانت دی جائے گی۔''

''میری نیک پاکیزہ بیٹی ہے۔ اسے کس طرح ایسے آدمی کے ساتھ بیاہ دوں جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔''

''نیک پاکیزہ ثریا سے مجھے یہ توقع ہوگئی ہے کہ وہ ملک مرادعلی کو واپس لے آئے گی۔''

''کمی تو آپ میں بھی کوئی نہیں، میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' مولوی رحیم الدین نے پہلا جملہ دھیرے سے اور دوسرا ذرا بلند آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، سوچ کر جواب دے دینا۔ کوئی حکم نہیں۔ گزارش ہے۔''

شاہ بانو نے کہا اور مولوی رحیم الدین کو جانے کی اجازت دے دی۔

مولوی رحیم الدین کو حویلی سے سوچنے کا کہہ کر گئے پورے سات دن گزر گئے تھے۔ آج رات ملک مرادعلی دونوں بھتیجوں سمیت لاہور سے آ رہے تھے۔ شرافت علی کی ضمانت ہوگئی تھی۔ بقول ملک مرادعلی کے کہ شرافت علی پر صرف الزام ہے، دینو کی بیٹی کی موت آئی تھی مرگئی اور بس دولت اور اثر ورسوخ کی بنا پر طاقتور جرم کر کے بھی چھوٹ جاتے ہیں۔

اس نے رات کے کھانے کی تیاری کا کہہ کر شرافت علی اور عنایت علی کیلئے کمرہ صاف کرایا اور خود اپنے کمرے میں گئی۔ اس کے ذہن میں کھچڑی پک رہی تھی کہ کس طرح اور کیا بات ملک مرادعلی سے کی جائے۔ بھاگ بھری نے اس کی مشکل حل کر دی۔

بی بی! ابھی صاحب کو لڑکی کا نام نہ بتانا۔''

''ارے نہیں! بعد میں لڑکی پر کوئی اعتراض ہوا تو۔''

''پھر بتا دیں لیکن ابھی مولوی رحیم الدین نے کوئی بات نہیں کی ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ مولوی رحیم الدین کا جواب ہاں میں ہوگا۔''

''اللہ کرے۔'' بھاگ بھری کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ جملے اکٹھے کرنے لگی۔ جونہی ملک مرادعلی آئے تو اس نے کھانے کا پوچھا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کمرے سے باہر جانے لگے تو وہ بولی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''شرافت علی، عنایت علی کے کمرے میں۔ تم دروازہ بند کر کے سو جاؤ۔''

"مگر..." وہ حیرت سے بولی۔

"مگر کیا؟"

"وہ بچے نہیں ہیں، سو جائیں گے۔" وہ غصے سے بولی۔

"میرے لیے بچے ہی ہیں، تمہیں کوئی کام ہے تو بتاؤ۔"

"مجھے کام نہ بھی ہو تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"زیادہ اونچی آواز میں اعلان کرو۔" وہ درشتی سے بولے۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ وہ غصے پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"صبح کر لینا۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ ذلت بھرے آنسو بہا کر لیٹ گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ بات کرنے والی ہی تھی کہ عنایت علی ہنستے ہوئے بولا۔

"سنا ہے چاچی! تم چاچے کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہو۔" اس نے چونک کر مراد علی کو دیکھا۔ وہ سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"شاوا بھئی! زنانی ہو تو چاچی جیسی۔" شرافت علی بھی بولا۔

"اس میں غلط کیا ہے؟"

"یہی بات تو ہم بھی چاچے کو سمجھا رہے تھے۔"

"اس گھر کو وارث چاہیے اس لیے یہ شادی کر رہی ہوں۔"

"اوئے یہ دو وارث تمہیں نظر نہیں آتے۔" ملک مراد علی نے فاخرانہ انداز میں بھتیجوں کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے چاچی کہنے والے نہیں ماں کہنے والے کی تمنا ہے۔"

"چاچی! اس میں بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے، چاچے کی طرف سے تو محرومی نہیں ہے۔" شرافت علی نے تضحیک کی آخری حد بھی پار کر لی۔

"شرافت علی! بات کرتے ہوئے خیال رکھا کرو کہ کس سے مخاطب ہو؟" وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جو بات کرنے والی تھی وہ درمیان میں رہ گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد ملک مراد علی ان دونوں کو چھوڑ کر اندر آئے تو وہ پھٹ پڑی۔

"کیا میری بات سننے کا کوئی وقت نہیں۔"

"اگر وہ شادی والی بات کرنی ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ عورت وورت کی میری زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے، مجھے شادی کی تمنا نہیں لیکن اگر تمہاری خواہش ہے تو بابا جب چاہو بتا دینا لے آئیں گے اسے۔"

انہوں نے انتہائی لاپرواہی سے اس کو وہ سب کہہ دیا جو وہ کسی اور طرح کہنا چاہتی تھی۔ کسی اور طرح منوانا چاہتی تھی۔ دل پر رقت طاری ہوگئی۔ ملک مراد علی کے نزدیک نہ اس کی حیثیت تھی اور نہ آنے والی کی۔

"اس کو صرف لانا نہیں ہے، اپنانا ہے۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک بات نہیں ہے ملک صاحب!" وہ زچ ہو کر بولی۔

"ہر روز آپ کی زندگی میں عورتیں آتی ہیں۔ ان کی حیثیت کیلے کے خشک چھلکے جیسی ہے، جس پر سے نہ کوئی پھسل سکتا ہے اور نہ سنبھل سکتا ہے۔ ثریا آپ کی حویلی کی آبرو بن کے آئے گی۔ اسے بیوی کا مقام چاہیے۔"

"ان چھلکوں کی اہمیت کا تمہیں کیا پتہ؟" وہ طنزیہ ہنسے۔

"پتہ ہے، اس اہمیت کا خمیازہ میں بھگت رہی ہوں۔"

"پھر اس میں اضافہ کرنا چاہتی ہو۔" وہ بولے۔

"میں آپ سے مایوس نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ جو کام میں نہ کر سکی وہ ثریا کرے گی۔"

"یہ ثریا کون ہے جس کا ہمیں اب تک پتہ نہیں چلا۔"

"مولوی رحیم الدین کی نیک سیرت بیٹی، میں نے مولوی صاحب سے بات کی ہے۔"

"تو مولوی رحیم الدین تو خوشی سے پاگل ہوگیا ہوگا۔" وہ فاخرانہ انداز میں ہنسے۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ انہوں نے سوچنے کا وقت لیا ہے۔"

"اسے اچھی طرح سوچنے دو، بس خیال رہے کہ عنایت یا شرافت میں سے کسی کو اس کا نام پتہ نہ معلوم ہو۔" یہ کہتے ہوئے ملک مراد علی کی آنکھوں میں سے عجیب سی چمک آئی۔ شاہ بانو خوفزدہ ہوگئی۔

''او کچھ نہیں ہوتا تمہاری ہونے والی سوتن کو۔'' وہ اسے خوفزدہ دیکھ کر لاپروائی سے بولے۔ وہ چپ ہوگئی۔ اس خاموشی میں ہفتہ گزر گیا۔

اس کے بعد ملک مرادعلی فارم ہاؤس چلے گئے۔ اسے دل ہی دل میں مولوی رحیم الدین کے فیصلے کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ اگر مولوی صاحب نے انکار کردیا تو ملک مرادعلی اس کو انا کا مسئلہ نہ بنالیں اور ثریا کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اس پریشانی میں اس نے خود مولوی رحیم الدین کو بلوا بھیجا وہ بھاگ بھری کے ہمراہ ہی آگئے۔ اس کے بات شروع کرنے سے پہلے وہ بولے۔

''ملکانی! آپ میں اور ثریا میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، خدالگتی کہوں کہ ثریا کیلئے تم نے ایمان کے ساتھ فیصلہ کیا ہے؟۔'' مولوی صاحب نے اسے تپتے میدان میں جلتے سورج کے نیچے کھڑا کردیا وہ سرتا پیر جل اٹھی۔ قوت گویائی جواب دے گئی۔ اتنی بڑی آزمائش۔ ایمان خطرے میں تھا۔ مولوی رحیم الدین اس کے جواب کے منتظر تھے۔ جبکہ وہ محتسب بنی اپنا احتساب کررہی تھی۔

''مولوی صاحب! بی بی ثریا کی ہمدرد ہیں۔ آپ یقین رکھیں۔'' بھاگ بھری نے اس کے سر پر بادل کا ٹکڑا رکھ دیا۔ وہ حواس بحال کرسکی۔

''اس کی کیا ضمانت ہے ملکانی صاحبہ کے پاس۔'' مولوی رحیم الدین نے گویا تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے کڑے امتحان سے گزرتا دیکھیں۔

''آپ کو جو ضمانت چاہیے وہ پکے کاغذات پر لکھوالیں۔'' وہ فقط اتنا کہہ سکی۔

''ملکانی جی! پکے کاغذات تو آپ کے بھائی نے بھی لکھوائے ہونگے، مجھے تو آپ کی ضمانت چاہیے۔'' مولوی رحیم الدین نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''اس گھر کے وارث کیلئے، خاندان کی آبرو کیلئے میں کچھ نہ کرسکی یہ میری قسمت ہے۔ ثریا کی قسمت ایسی نہیں ہوگی۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''آپ اگر اتنی پرامید ہیں تو میں کیسے ناامید ہوسکتا ہوں۔ ایک بار پھر آپ ملک صاحب سے پوچھ لیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ مبارک دن اور تاریخ بتادیجئے۔''

''بیٹی! جو آپ طے کرو وہ ایک دو روز پہلے کہلوا بھیجنا۔'' مولوی رحیم الدین یہ کہہ کر

اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ کا بہت شکریہ۔'' شاہ بانو نے کہا، مولوی صاحب چلے گئے۔ بھاگ بھری مولوی صاحب کو باہر چھوڑ کر جب واپس آئی تو اس کا چہرہ فکرمندی کی لکیروں سے بھرا ہوا تھا۔

''بھاگ بھری! کیا بات ہے؟۔''

''بی بی! مولوی رحیم الدین جاتے جاتے میری روح مٹھی میں بند کر کے لے گئے ہیں، بختاں والا مجھے سولی چاڑھ گیا ہے۔

''وہ سوال کرگیا ہے کہ بھاگ بھری! ملکانی نے تو میری ثریا کو بنا دیکھے فیصلہ کرلیا ہے۔ پر تو نے میری ثریا کو دیکھا ہے۔ کیا تو نے بھی ایمان سے فیصلہ کیا ہے؟'' بھاگ بھری لحہ بھر کو رکی اور پھر بولی۔

''بی بی! وہ کہہ گیا ہے کہ اک واری سوچنا ضروری۔ حویلی کی دیواریں تو آ ہیں جھیل جاتی ہیں پر تیرا تو کچا کوٹھا ہے۔'' بھاگ بھری کہیں دور سے مولوی رحیم الدین کے جملے دہرا چکی تو شاہ بانو نے اپنے لرزتے ہاتھ سے اس کا شانہ دبایا۔

''یا خدا! تو، تو جانتا ہے کہ میں تیرے بھٹکے ہوئے بندے کی واپسی کیلئے ایسا کررہی ہوں۔ ثریا سے پیدا ہونے والے وارث کی وجہ سے ہی تیرا بندہ لوٹ آئے۔'' شاہ بانو نے صدق دل سے اللہ کو مخاطب کیا۔

''بی بی! بہت مشکل کام ہے میں تو کیا میرے پرکھوں نے ملکوں کی خدمت میں عمر گزاری ہے۔ یہ کبھی نہیں بدلے، یہی دیکھا اور یہی سنا کہ حوریں بھی حویلی میں آئیں تو تنہائی میں گھٹ گھٹ کر مرگئیں۔ باہر کی عورتوں سے ملکوں کی زندگیاں آباد رہیں۔ دیکھتی نہیں کہ گاؤں کے گاؤں اک اک وارث کے حصے میں آتے ہیں، وارث حویلی میں پیدا ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' بھاگ بھری نے کربناک لہجے میں اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر کہا۔

''نہیں، مجھے اللہ سے امید ہے کہ ملک صاحب کی واپسی ہوگی۔ اس حویلی میں معصوم بچے کی کلکاریاں صراط مستقیم بن جائینگی۔'' شاہ بانو نے وثوق سے کہا۔

''اللہ کرے، پر بی بی ایک واری ہور ملک صاحب سے پوچھ لو۔'' بھاگ بھری نے

مشورہ دیا۔ شاہ بانو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔''

ملک مراد علی کے انتظار میں تقریباً دس دن گزر گئے۔ وہ مزید پوچھنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود شادی کی ضروری تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ جونہی ملک مراد علی آئے تو فوراً فریش ہونے کیلئے واش روم میں گھس گئے۔

کچھ دیر بعد وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بیڈ پر لیٹ گئے۔ شاہ بانو کو دیکھ کر قریب بلایا اور بولے۔

''شاہ بانو! تمہیں پھر سے ماں بننے کی خواہش نہیں ہوئی۔''

''جی! اسی خواہش کی تکمیل کیلئے ہی تو آپ کی دوسری شادی کر رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کر رہی ہوں، حویلی میں خواتین تحکمانہ گفتگو نہیں کرتیں۔'' وہ بدک کر بولے۔

''میں نے آپ سے اجازت لے کر ہی۔ ''

''اچھا! اچھا! آگے چلو' اگر دوسری بیوی بھی مردہ بچوں کی .....؟''

''خدا نہ کرے۔ اللہ سے اچھی امید رکھتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے ان کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ شادی وادی ہمارے خاندان کے مردوں کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی حویلی میں جگہ ہی جگہ ہے جتنی چاہو عورتیں رکھ لو۔''

''میں عورت نہیں آپ کی دوسری بیوی لانا چاہتی ہوں۔ مجھ سے زندہ اولاد نہیں ہوتی۔ اس لیے اک شرعی بیوی اور وارث کی ضرورت ہے اس حویلی کو۔'' وہ کچھ سخت لہجے میں کہہ گئی۔

''حویلی کیلئے میں کافی ہوں، تم فکر نہ کرو، تمہیں خدمت کیلئے ملازماؤں کی ضرورت ہے۔ جتنی چاہو رکھ لو، اور دل بہلانے کو بچہ چاہیے تو ہزاروں کھلونے بچوں سے بھی زیادہ دل بہلاتے ہیں۔'' وہ شان بے نیازی سے کہہ کر آنکھیں موندنے کو ہی تھے کہ وہ بولی۔

''آپ کو مولوی رحیم الدین کی ثریا سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔''

''ہم تو گھوڑے، کتے کی بھی نسل دیکھتے ہیں۔ تمہیں جانے مولوی رحیم الدین کی

ثریا ہی کیوں بھا گئی ہے۔'' وہ طنزیہ بولے۔

''صرف اور صرف نیک سیرت اور پاکیزہ فطرت ہونے کی وجہ سے اور ویسے بھی کون دوسری شادی کیلئے اپنی بیٹی دیتا ہے۔'' وہ بھی دل میں چھپا طنز نہ چھپا سکی۔

''اسی لیے تو ہم ہاتھ بڑھا کر جو چاہیں اٹھا لیتے ہیں، دولت کی کشش سے واقف ہو شاہ بانو بیگم۔'' وہ ابرو چڑھا کر بولے اور سونے کی غرض سے آنکھیں موند کر لیٹ گئے۔

''پھر تیار ہیں نا۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''شاہ بانو جو چاہو کرو، اب سونے دو۔'' وہ اکتا کر بولے۔

شاہ بانو کو کچھ تسلی سی ہوگئی۔ بس وہ ہر ممکن ملکوں کی زندگی اور حویلیوں کی روایت بدلنا چاہتی تھی۔ ایک اچھی باوفا بیوی کی ذمہ داری ادا کرنا چاہتی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ سے امید تھی کہ ملک مراد علی میں ثریا کے آنے سے تبدیلی ضرور آئے گی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

اگلی صبح وہ قرآن پاک کی تلاوت ہی کر رہی تھی کہ ملک شرافت علی اور ملک عنایت علی آ گئے۔ اس کی پیشانی پر ہزار سلوٹیں پڑ گئیں۔ ملک مراعلی ان کی وجہ سے انھیں یہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے دھیرے سے بولی۔

''ملک صاحب! کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے باہر بیٹھتے ہیں۔''

''اوئے چاچی! کیا ہوا؟ چاچا دوجے ویاہ کی خوشی میں بیمار ہو گیا۔'' عنایت علی نے ہنس کر کہا۔

''کبھی بات کرتے ہوئے ادب و آداب کا خیال بھی کر لینا چاہیے۔'' اس نے دھیمے انداز میں طنز کیا۔

''شاہ بانو! کیوں ان دونوں کی ہر وقت کلاس لیتی رہتی ہو؟'' ملک مراد علی نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں خوش ہو گئے۔

''ملک جی! ادب احترام تو ہونا چاہیے نا۔'' شاہ بانو نے چڑ کر کہا۔

''یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔''

''چھڈ چاچا! چاچی کونسا برے دل سے کہتی ہے۔'' عنایت علی نے کہا۔

''چاچا! ہم ڈیرے پر جا رہے ہیں، ادھر ہی آ جانا۔'' شرافت علی بولا۔

"نہیں یہ آج کہیں نہیں جا رہے، ان کی آج بہت ضرورت ہے۔"

شاہ بانو نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

"کیا ضروری کام ہے؟" ملک مراد علی نے پوچھا۔

"ڈیرے پر کیا کام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چاچی! مردوں کے ہزار کام ہوتے ہیں اب تمہیں کون کونسے بتائیں؟

عنایت علی نے دائیں آنکھ دبا کر پہلے چاچے اور بھائی کو دیکھا اور پھر مسکرا کر کہا۔

"ملک مراد! آپ کو پتہ ہے میں نے تاریخ لینے جانا ہے اور آپ۔" شاہ بانو نے بھنچے بھنچے لہجے میں غصے سے کہا، تو مراد علی ہنس کر بولے۔

"بھئی! تمہیں اختیار دے دیا ہے تم جو چاہو کرو، اس سے پہلے ایسا کبھی ہوا نہیں ہے ہم ملکوں کی زندگی میں۔ لیکن تمہاری وجہ سے نئی رسم ڈال رہا ہوں۔

"ویسے پتہ تو چلے کے ہماری چاچی نے اپنی سوت کس گھر میں تلاش کی ہے۔" شرافت علی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"اوئے تم چھوڑو اس قصے کو، ڈیرے پر چلو میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔" ملک مراد علی نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں شانے اچکا کر آگے بڑھ گئے، ملک مراد علی واش روم میں گھس گئے۔ شاہ بانو نے سکھ کا سانس لیا۔ ان دونوں سے اسے دلی نفرت تھی۔ وہ اٹھ کر الماری کھول کے اپنے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔ کپڑوں کے انتخاب میں اس قدر منہمک دیکھ کر ملک مراد علی مسکرائے اور طنزیہ بولے۔

"پہلی بار ایک عورت کو سوکن لانے کی خوشی میں مگن دیکھ رہا ہوں۔" وہ پلٹی اور قریب آ کر بولی۔

"نہیں ملک صاحب! آپ کے پاس کچھ بھی ٹھیک دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"بس! بس! فلسفہ نہیں، کبھی کبھی تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ تم امریکہ یا برطانیہ سے آئی ہو، اپنی اپنی سی لگتی ہی نہیں۔"

"امریکہ اور برطانیہ میں تو سنا ہے لوگ ہماری طرح سوچتے ہی نہیں۔"

"اچھا خیر! ناشتہ تو منگواؤ۔" وہ ٹال گئے۔ اس نے مسکرا کر ان پر ظاہر کیا کہ ان

کی سوچ غلط ہے۔

ملک مراد علی کا موبائل مسلسل بج رہا تھا، ناشتہ نہیں آیا تو وہ جھلا اٹھے۔

"عنایت علی بیل پر بیل دے رہا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔" اسی اثنا میں بھاگ بھری ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آ گئی۔ شاہ بانو نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود ملک صاحب کے سامنے رکھی میز پر ناشتے کا سامان رکھنے لگی۔ اسی وقت باہر شور سا برپا ہوا۔ ملک مراد علی کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ شاہ بانو بھی پریشان ہو گئی۔ مگر اس کے پوچھنے اور جاننے سے پہلے بدحواسی کے عالم میں بھاگ بھری، مولوی رحیم الدین اور پیچھے منشی داخل ہوا مولوی رحیم الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان کی چہرے کی شکنوں سے گزرتے ہوئے آنسو نے سفید ڈاڑھی بھگو دی تھی۔ وہ گھگھیائی آواز میں کانپتے لرزتے ہاتھ شاہ بانو کے سامنے جوڑتے ہوئے بولے۔

"بی بی! میری ثریا کو بچا لو" شاہ بانو کچھ نہ سمجھی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا ثریا کو؟"

"وہ، وہ لے گئے میری ثریا کو اسے بچا لو۔" مولوی رحیم الدین گڑگڑائے۔

"او منشی! کیا معاملہ ہے، کیسے اندر منہ اٹھائے آنے دیا ہے۔" ملک مراد علی نے گرجدار آواز میں منشی کو للکارا۔

"میں نے بہت روکا، مگر یہ اندر آ گیا" منشی نے گردن جھکا کر کہا۔

"یہ جاننے کی کوشش کی تم نے کہ یہ اندر کیوں آیا ہے؟ اور اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟" شاہ بانو نے منشی کو سختی سے کہا۔

"بولو! مولوی صاحب اصل معاملہ کیا ہے؟" ملک مراد علی نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"ملک صاحب! وہ نکے ملک صاحب آپ کی عزت اٹھا لے گئے۔"

"کیا مطلب؟ میری عزت......؟" ملک مراد علی کو ناگوار گزرا۔

"ملک صاحب! یہ ثریا کا باپ ہے، ثریا اس حویلی کی عزت ہے اور ملک عنایت علی اور ملک شرافت علی آپ کے بھتیجے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پر اتنی آسانی سے ہر چیز کو ہماری حویلی کی عزت نہ بنا دیا

کرو۔ وہ ابھی اس حویلی میں آئی نہیں اور تم نے ہماری پرکھوں کی عزت اس کے نام لگا دی۔

''مراد علی! اتنے سنگدل اور بے حس مت بنو۔ میں نے مولوی صاحب سے ثریا کو عزت دینے کا وعدہ کیا ہے اور۔۔۔۔وہ۔۔۔'' شاہ بانو بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

''یہ رونا دھونا بند کرو۔ وعدہ کیا تھا تو کونسی قیامت آ گئی۔ ابھی بلوا دیتے ہیں۔ ہم کمی کمین نہیں ہیں۔ عزت دار لوگ ہیں۔''

ملک مراد علی شیر کی طرح دہاڑے اور منشی کو موبائل دے کر عنایت علی کا نمبر ملانے کو کہا۔ کچھ فاصلے پر جا کر دھیرے سے کچھ بات کی اور واپس آ کر بولے۔

''مولوی صاحب! باہر بیٹھ کر اپنی بیٹی کا انتظار کرو، وہ آ رہی ہے اور ہاں، کل شام سے پہلے ہمارا گاؤں چھوڑ دینا۔ ایسی آوارہ لڑکیوں کی وجہ سے ہماری عزت پر دھبہ لگتا ہے۔''

وہ منشی کے ہمراہ باہر نکل گئے۔ شاہ بانو کے قدموں پر جھکے مولوی رحیم الدین نے بھیگی پلکوں سے پہلے بھاگ بھری کو دیکھا اور پھر شاہ بانو کو۔ مگر شاہ بانو تو پتھر کی مورت بن گئی تھی۔



یہ کیسی عورت ہے؟

کافور اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی خوشبوؤں کے ساتھ ہی ملی جلی مردانہ آوازوں کا شور بلند ہوا تو اس کے کندھے ہلاتے ہوئے صغریٰ نے کہا۔

''اری بتول! اٹھ' دیکھ تیرے سر کے سائیں کو لے جا رہے ہیں۔ کیا تو پتھر کی ہو گئی ہے۔ چار آنسو تو بہا لے۔ وہ آخر کو تیرا گھر والا تھا۔''

''ہائے! بے چاری کیا آنسو بہائے۔ ساری زندگی آنسوؤں میں تو بتائی ہے اس نے۔ کس نے دیکھا ہے اسے ہنستے' مسکراتے۔ اور کون جانتا ہے کہ یہ بے چاری سہاگن بھی ہے؟'' نذیراں نے خاموش مورت بنی اس کی زبان کا روپ دھارا تو گویا ساری کی ساری جاگ گئیں اور سب کی یادداشتیں واپس آ گئیں۔ کوئی دائیں سے آگے سرکی' تو کوئی بائیں سے' کسی نے الجھے بال سنوارے تو کسی نے سہارا دیا۔ مگر سب یک زبان ہو گئیں۔

''یہ بے چاری تو جنم جنم سے سیاہ بخت ہے۔ اس کے تو سگے بھی اپنے نہ ہوئے۔ یہ تو پھر صادقہ بیگم صاحبہ کے صاحب کی بات ہے۔ وہ تو صرف اور صرف بیگم صاحبہ ہی کے تھے۔ مر کر بھی بیگم صاحبہ کی حکمرانی تھی۔ یہ غریب تو خواہ مخواہ کی گھر والی تھی۔'' اماں نذیراں کی بہو نرگس نے ہمدردی سے کہا۔

''بس اللہ اس جیسی قسمت کسی دشمن کی بھی نہ کرے۔'' حکیماں نے تاسف سے کہا۔

''اب تو سکھی ہو گئی' گھر بار کی اکیلی مالک ہو گی۔'' زینب نے بھی حصہ لیا۔

''ارے نہیں بہن! دیکھ لینا سب کچھ صاحب اپنے بچوں کے نام کر گئے ہوں

گے۔'' پھپھو نے کہا۔

''ارے وہ کدھر ولایت سے آنے والے ہیں۔ بچپن سے گئے سب نے دیکھے پر ماں کے مرنے سے لے کر اب تک کسی نے انہیں یہاں نہیں دیکھا۔'' نذیراں بولی۔ گھر کی دوسری اہم پرانی ملازمہ نذیراں ہی تھی۔ جو سب کچھ جانتی تھی۔ باقی تو محلے دار تھیں۔

''چلو اسے باہر لے چلیں۔ جنازہ لے جانے کیلئے مرد جمع ہو گئے ہیں۔'' حکیماں اٹھتے ہوئے بولی۔ اچانک باہر کلمہ شہادت کی آوازیں بلند ہوئیں تو سب ایک ایک کر کے باہر چلی گئیں۔ عورتوں کی یہ بھی ایک پرانی پختہ عادی چلی آ رہی ہے کہ محلے سے گزرنے والی ہر بارات اور ہر جنازے کو کھڑکیوں اور چھتوں سے لٹک لٹک کر ضرور دیکھتی ہیں۔

پھر گھنٹوں رواں تبصرے کرتی ہیں۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ صادقہ بیگم کے تابعدار شوہر کا جنازہ تھا۔ اسے کندھا دینا اور آخری دیدار کرنا ہر ایک کی خواہش تھی تا کہ صادقہ بیگم سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت دے سکے۔ بظاہر مر جانے کے باوجود وہ سب کے لئے زندہ تھیں۔ اردگرد تھیں اور یہ کہہ رہی تھیں کہ دیکھ کر۔ دھیان سے میاں صاحب کو تکلیف نہ پہنچے' کوئی ٹھیس نہ لگے۔ زندگی بھر وہ سب کے لئے ہر دلعزیز ہی اس لئے تھیں کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ سب خوش رہیں۔ محلے کا کوئی انسان ان سے ناخوش نہ رہے۔ اس خوشی کی فراہمی میں کس کے دل کے آبگینے کو ٹھیس لگی' کسی کو رنج ملا یہ انہیں کبھی پتہ نہ چلا۔ انہوں نے تو اپنے تئیں عظیم ترین کام کیا۔ انسانیت کا بلند ترین معرکہ مارا۔ سب دنگ رہ گئے۔ ششدر رہ گئے۔ بتول بھی حیرت زدہ سی دو دن تک کچھ نہ بول سکی تھی۔ لہٰذا کسی میں یہ جسارت کہاں تھی اور آج بھی سب ان کے حکم کے تابع ہی تو تھے۔ میاں صاحب پر نثار ہو رہے تھے۔ اشک بہا رہے تھے۔ ایک ہجوم امڈا چلا رہا تھا۔

اندر وہ اکیلی تھی۔ اپنی جگہ پتھر کی سل بنی بیٹھی تھی۔ شور اٹھا اور معدوم ہو گیا۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ سوائے نذیراں کے۔ وہ آنسو پونچھ کر اس کے کمرے میں ایک کونے میں آ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ اٹھی اور دروازے سے باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ بہت سناٹا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ایک دم اسے صادقہ بیگم کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ذہن میں جیسے رکی ہوئی ٹیپ چل رہی تھی۔

''یہ میرا گھر تو نہیں ہے۔ میرا تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''نہیں بتول! یہ اب تمہارا گھر ہے۔ جاؤ سب کچھ تمہارا ہے۔ ہم تو خود تمہیں یہاں لائے تھے۔''

''ہوں ہاں! مگر......'' آواز حلق میں اٹک گئی۔

''بتول! پورا گھر تمہارا ہے۔ تمہارا ہے۔ اب سب کچھ تمہارا ہے۔'' جیسے صادقہ بیگم نے رٹ لگا دی۔ وہ رو دی۔

''اب آس ہی کیا ہے؟ ضرورت ہی کیا ہے؟ زندگی اب گھر اور کمرے کی محتاج نہیں ہے بیگم صاحبہ جی! اب تو مزار یا قبر کہیں بھی مجاور بن کر رہا جا سکتا ہے۔ اب بچا ہی کیا ہے؟''

''اوں ہوں تم یہاں صاحب کے نام سے وابستہ ہو۔ مزار مقبروں میں رہ کر ہماری عزت خراب کرو گی۔'' آواز میں سرزنش تھی۔

''ایک نام کا ہی تو اب تک سودا تارنے کی کوشش ہے۔ مگر نہ قرض اترا اور نہ سود۔ بتول ہی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ بے قیمت ہو گئی۔ بے ضرورت ہو گئی۔ اس کے اندر سسکیاں جاگ اٹھیں۔

☆......☆......☆

''کیوں ہلکان ہوتی ہے۔ چل اندر رات سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ کچھ کھا لے۔'' نذیراں نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سہارا دے کر کمرے کی طرف چلنے لگی۔

''ابھی کیسے کھا لوں کچھ۔ اماں نذیراں۔ میت کی تدفین کے بعد کڑوے لقمے کھاتے ہیں۔ وہ تو پھر میرے سر کے تاج تھے۔ پہلے کیسے کچھ کھا لوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ اماں نذیراں نے محسوس کیا۔

'چھوڑ سر کے تاج کو۔ جانتی ہوں میں سب۔ اب تک کسی وجہ سے زبان بند رکھی۔ اب تو اپنی زندگی حرام نہ کر تو۔'' نذیراں نے سختی سے کہا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''دیکھا اماں نذیراں تو نے۔ کس قدر سناٹا ہے۔ کیوں تو نے اپنے پوتے کو مارا' رونے دے اسے۔ کچھ تو شور ہو۔ کوئی تو آواز ہو۔''

''سناٹا تو ہے پر تجھے آرام کی ضرورت ہے۔ جا جا کر اپنے کمرے میں سو جا۔

یہاں کتنی گرمی ہے۔ وہ ٹھنڈا کرنے والی مشین چلا لے۔'' اماں نذیراں نے دلار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو ڈھیر ساری تھکن اماں نذیراں کی بوڑھی انگلیوں کے ساتھ ہی نکل گئی۔

''وہ میرا کمرہ نہیں ہے اماں نذیراں۔ بیگم صاحبہ اور صاحب جی کا ہے۔ میں نے تو آج تک اس کے اندر قدم نہیں رکھا۔ یہ کمرہ ہی میرا ہے۔''

''جانتی ہوں۔ سب جانتی ہوں۔ پر اب تو ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ کوئی منع کرنے والا' پابندی لگانے والا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ جا آرام کر لے۔''

''نہیں اماں نذیراں! جو چیز اپنی نہیں وہ کبھی اپنی نہیں ہوتی۔ جو حق میرا تھا ہی نہیں وہ اب کیسے لے لوں۔ یہ تو بے ایمانی ہوگی۔ اپنے ساتھ بھی اور بیگم صاحبہ کے ساتھ بھی۔ میں کبھی بیگم صاحبہ کے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ احسان فراموشی نہیں کر سکتی۔ یہ بات تو بیگم صاحبہ بھی جانتی تھیں کہ بتول سچا موتی ہے۔ مان نہیں توڑے گی۔ چاہے خود ٹوٹ پھوٹ جائے۔ دیکھ! دیکھ! اماں نذیراں بتول پورے دس سالوں میں کیسے کیسے ٹوٹی ہے؟ کہاں کہاں سے ٹوٹی ہے؟'' لہجے میں ٹوٹ پھوٹ کا شور ضرور تھا مگر انتہائی دھیمے پن کے ساتھ انتہائی صبر و برداشت کے ساتھ۔

''پگلی ہے تو۔ ارے وہ مر کھپ گئے ہیں۔ اب تو صرف تو زندہ ہے۔ سب کچھ تیرا ہے۔''

''خیرات میں تو ہمدردی اور محبت بھی بتول کو گوارا نہیں۔ یہ میری محسنہ کا گھر ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا احسان کیا تھا انہوں نے مجھ پر۔ میں امانت سمجھ کر حفاظت کروں گی۔ ان کے بچوں کی آمد تک۔ تو جانتی ہے۔ سب کچھ۔ میں کون ہوں؟ میرا مقام کیا ہے؟ میں کیسے یہاں آئی......؟ کون مجھے لایا......؟ بلکہ میں دنیا میں ہی کیوں آ گئی؟''

''اماں کہتی تھی کہ میں بلا ضرورت آ گئی تھی۔ دو کمروں کے کچے پکے گھر میں کسی کو میری ضرورت نہیں تھی۔ میری جگہ بیٹے کا انتظار تھا۔ اسی لئے تو اماں چھلے میں ہی تھی کہ ابا نے بہانہ رکھ کے انہیں روئی کی طرح دھنک پھینکا تھا۔ میرے آنے کی وجہ سے اماں کڑے عذاب کا نشانہ بنی تھی۔ ابا بات بات پر مارنے پیٹنے لگتے۔ طعنے تشنے دے دے کر جینا حرام کر دیتے۔ اماں ننھی سی جان کو آغوش میں بھرے چھپاتی پھرتیں۔ پھر ابا نے اماں سے جان

چھڑانے کے لیے اپنے محلے کی جوان بیوہ بانو سے شادی کے وعدے کر لئے۔ بیٹے کی خواہش تھی یا پھر مرد کا دوسری شادی کا جنون۔ پہلی بیوی کے مقابل بدصورت عورت بھی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سلو برف والے کی بیوہ بانو بھی ابا کے لیے کل کائنات بن کر گھر میں آ گئی۔ میں اور اماں صرف ایک کمرے تک محدود ہو گئے۔ اماں بے چاری سوتن کے آتے ہی گھر کی مالکن سے خادمہ بن گئیں۔ اندر ہی اندر گھن لگ گیا۔ میرے حلق میں دودھ کی بوند نہ جاتی۔ جب کہ ابا بانو کے چاؤ چوچلوں پر دکان کی ساری آمدنی لٹا دیتے۔

دو سال جیسے تیسے گزرے مگر جونہی اقبال دنیا میں آیا تو ہماری دنیا بالکل اندھیر ہو گئی۔ ابا بیٹے کی آمد پر جھوم جھوم اٹھے۔ بانو اور زیادہ مغرور اور ظالم ہوگئی۔ یوں ہماری رہی سہی زندگی کی خوشیوں پر بھی تالے پڑ گئے۔ ابا نے تو کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ میں رات دن اماں کے پلے سے بندھی رہتی تھی۔ اماں جو اندر ہی اندر گھل رہی تھی آخر ایک روز ایسی سوئی کہ میری چیخیں بھی اسے واپس نہ لا سکیں۔

میں صرف چھ سال کی تھی مگر ابا اور سوتیلی ماں نے مجھے سولہ سال کی سمجھ لیا تھا۔ سارے گھر کے کام کاج میرے ذمے تھے۔ اقبال تک کی دیکھ بھال بھی میں ہی کرتی۔ جوں جوں اقبال بڑا ہو رہا تھا۔ مجھ پر اور سختیاں شروع ہوگئی تھیں۔ اقبال مجھے جو چیز چاہتا دے مارتا۔ میرے رونے پر بھی مجھے ہی قصوروار سمجھ کر مارا جاتا۔ یہ سلسلہ چلتا ہی جا رہا تھا کہ اچانک ابا کی موت واقع ہوگئی۔ تو پھر تو جیسے نہ قدموں تلے زمین رہی اور نہ سر پر آسمان......اور زیادہ ظلم شروع ہو گئے۔ روٹی کے طعنے ملنے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مار پڑتی۔

وقت گزرتا گیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد تھا کہ میں چودہ سال کی تھی۔ جب اقبال نے مجھے ابا کی چھڑی سے بہت مارا۔ میرے رونے اور فریاد کرنے پر اماں نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں بند دروازے پر کھڑی روتی رہی۔ فریاد کرتی رہی مگر کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ صرف ہماری غریب ہمسائی کو رحم آیا۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر اپنے گھر لے آئی۔ اس نے کھانا کھلایا اور چوٹوں پر دوا لگائی۔

میں ساری رات درد سے تڑپتی رہی۔ میں وہاں اس بیوہ غریب زبیدہ کی بیٹی بن کر رہنے لگی۔ گھر والوں نے ایک محلے میں رہتے ہوئے بھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔ کچھ عرصے بعد زبیدہ نے یہاں اس محلے میں گھر لے لیا۔ پھر ہم یہاں رہنے لگے۔ مگر اقبال کو یہ بات

اچھی نہ لگی۔ اس رات وہ مجھے قتل کرنے کے لیے دیوار پھلانگ کر آیا مگر اماں زبیدہ کے شور مچانے پر بھاگ گیا اور پھر صبح ہوتے ہی اماں زبیدہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ میں اکیلی اس کا انتظار کرتی رہی مگر صبح سے رات ہوگئی وہ نہیں آئی۔ شاید اقبال سے ڈر کر کہیں چلی گی تھیں۔ مگر کہاں؟ یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں تو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ رات ہوئی تو میرے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔ میں ہمت کر کے گھر سے باہر نکلی۔ ایک گلی چھوڑ کر یہاں اس کوٹھی کے دروازے پر دستک دے بیٹھی۔ اس کے آگے تو' تو جانتی ہے اماں نذیراں۔'' وہ لمبی کہانی سنانے کے بعد جیسے تھک کر بولی۔

''ہاں! اچھی طرح میں اس گھر کی پہلی ملازمہ ہوں۔ صادقہ بیگم نے بیاہ کر جب اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس سے بھی پہلے کی میں یہاں ہوں۔ میں نے اس گھر کے سب موسم دیکھتے ہیں۔ پر کیا فائدہ سب کچھ یاد کرنے کا۔''

''یادوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ اماں نذیراں! میرا دل چاہ رہا ہے کہ تو چپ چاپ میری زبانی میری کہانی سنتی رہ۔ میں بولتے بولتے تھک جانا چاہتی ہوں۔ تو صرف سن لے۔ چوکیدار نے مجھے میٹنگ ہال میں بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد بہت حسین درمیانی عمر کی صادقہ بیگم ہال کے دائیں طرف والے دروازے سے داخل ہوئیں۔ میرا حلیہ اور رخساروں پر پھسلنے والے آنسو دیکھ کر وہ پریشان ہوگئیں۔ بے قراری سے میرے قریب آئیں اور پوچھا۔

''کیا مسئلہ ہے......؟'' انہوں نے اس طرح پوچھا جیسے ہر مسئلے کا حل ان کی مٹھی میں موجود ہو۔ میں رو دی۔

''رونے کے بجائے اصل بات بتاؤ بیٹھو۔'' انہوں نے مجھے پیار سے بٹھایا۔ میں موٹے نرم سے قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ خوب صورت بڑی سی سب سے نمایاں اور عمدہ سی کرسی پر شان سے بیٹھ گئیں۔ اور پھر انہوں نے تمہیں' ہاں تمہیں آواز دے کر بلایا۔'' وہ کھو سی گئی۔

''نذیراں......؟''

''جی بیگم صاحبہ!'' مؤدب سی نذیراں اپنے دوپٹے سے گیلے ہاتھ صاف کرتی ہوئی آئی۔

''نذیراں! اس لڑکی کے لئے کچھ کھانے پینے کو لاؤ۔ یہ صرف خوف کھا رہی ہے۔'' صادقہ بیگم نے اس کے بیٹھتے دل اور پپڑی زدہ ہونٹوں سے سب کچھ جان لیا تھا۔ نذیراں جی

اچھا کہہ کر جس دروازے سے آئی تھی اسی سے باہر نکل گئی۔ اس کے بعد صادقہ بیگم نے چھوٹے چھوٹے برمحل سوالات کے ذریعے بتول کے بارے میں سب کچھ جان لیا۔ اور ایک لمبی ''ہوں'' کھینچ کر وہ کہیں دور نکل گئیں۔ نذیراں کھانا لے آئی۔ اس نے کھا پی لیا لیکن صادقہ بیگم کرسی کی پشت سے سر ٹکائے چپ بیٹھی تھیں۔

''وہ مشکل میں آ گئی تھیں۔ ویسے تو اردگرد کے محلوں سے عورتیں' لڑکیاں اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتی رہتی تھیں۔ کسی کا شوہر بے روزگار ہے تو کسی کا کام چور ہے۔ کوئی بیمار تو کوئی نشہ باز۔ کسی کے بچے کو سکول میں داخلہ نہیں ملا تو کسی کو کام نہیں ملا۔ کسی کی ساس نندیں دشمن ہیں تو کسی کا شوہر جان کے درپے ہے۔ ایسے بے شمار مسئلے روزانہ ان کے پاس آتے تھے۔ وہ نو بجے سے گیارہ بجے تک کرسی پر کمر جما کر بیٹھتیں اور سب مسئلے نمٹا کر اٹھتیں۔ میٹنگ ہال بھرا رہتا مگر ان کے ماتھے پر ایک شکن نہ آتی۔ اپنے سب کام کاج چھوڑ کر مصروف رہتیں۔ میاں صاحب یا بچے کوئی انہیں درمیان میں نہیں بلاتا تھا اور میرے لئے بھی وہ گہری سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

میں نے تو کھل کر منت کی تھی کہ مجھے پناہ چاہئے' سائبان چاہئے' کیا دے سکتی ہیں آپ؟'' انہوں نے چونک کر میری طرف بغور دیکھا اور پھر چپ ہوگئیں۔

''مجھے انہوں نے فی الحال تمہارے ساتھ رکھنے کو کہا بلکہ یہ کہا کہ اپنے ساتھ والا کوارٹر کھول کر صاف کراؤ۔ اس میں تم اس کے ساتھ رہو۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ بہت بڑی آزمائش ہے۔ سر سے پیر تک چھپانے کے قابل' حفاظت کے لائق۔''

''سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ محلے بھر کے مسائل حل کرنے والی صادقہ بیگم کیا میرے لئے بے بس ہوگئی تھیں؟''

''نہیں' بس تمہارا مسئلہ تھوڑا سا الجھا ہوا تھا۔ تمہارے بھائی کی وجہ سے' سوتیلی ماں کی وجہ سے کہ وہ کچھ پریشان ہوگئی تھیں۔ ورنہ ڈرنے والی نہیں تھیں وہ۔ میاں صاحب محکمہ جنگلات میں اعلیٰ افسر رہے تھے۔ بڑے تعلقات تھے ان کے۔ پھر جدی پشتی زمیندار تھے۔ بڑے مربعوں کے مالک تھے۔ شہری زندگی بیگم صاحبہ کو پسند تھی۔ میاں صاحب ان کی پسند کے سامنے تو زہر بھی ہنس کر پی لیتے۔ یہ تو پھر شہر میں رہنے کی بات تھی۔ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے مستقل شہر کے ہوگئے تھے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں

تھی کہ وہ تمہارے بھائی کی پولیس سے چھترول نہ کرا سکتیں۔ بس ویسے ہی اس مسئلے کو بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔ بڑی رکھ رکھاؤ والی عورت تھیں۔ تمہاری خوبصورتی اور جوانی کو اشتہار نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ اسی لیے تو جیسے ہی میٹنگ ہال میں موجود محلے والیوں نے تمہارے کیے ان سے سوال جواب کیے تو وہ غصے میں آ گئیں اور لاڈو کو بری طرح جھڑک کر کہا یہ مسئلہ میرے گھر کا ہے۔''

پھر کلثوم نے بڑی ہوشیاری سے انہیں یہ کہہ دیا کہ کیا آپ اسے ہمیشہ کیلئے اپنے پاس رکھیں گی؟'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر رخشندہ نے اپنے طور پر کلثوم کو جواب دے دیا کہ جوان خوبصورت لڑکی کو اس طرح تو گھر میں نہیں رکھا جاتا۔ کوئی وجہ ہے' نہ رشتہ' بیگم صاحبہ سوچ سمجھ کر ہی اپنے پاس رکھیں گی۔'' صادقہ بیگم نے بہت غصے سے اسی وقت میٹنگ ختم کر دی۔

''اونہہ! پھر دو دن تک وہ کسی سے نہیں ملی تھیں۔ صرف صاحب کے ساتھ کمرے میں کسی موضوع پر بات کرتی رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ عمیر اور عامر کی امریکہ روانگی والے دن وہ مطمئن اور خوش تھیں۔ مصروف تھیں پورے گھر میں چہل پہل تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے نوجوان بیٹوں کو امریکہ بھیج کر وہ پرسکون ہو گئی تھیں۔ اس شام انہوں نے مجھ سے بھی ڈھیروں باتیں کی تھیں۔

میرا سلیم چھٹیاں ختم کر کے کراچی اسی دن گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اسے راستے کے لیے قیمہ بھرے پراٹھے بنوا کر دیئے تھے۔ جب سب سو گئے تو وہ میرے پاس آئیں۔ سلیم کا بیٹا میری گود میں سویا تھا۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دبایا تو میں سمجھ گئی کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے گڈو کو اس کی ماں کے حوالے کیا اور ان کے ساتھ اندر آ گئی۔ وہ لان کی طرف آ گئیں۔ اپنی کرسی کے پاس دوسری کرسی کھینچی اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں حیران تھی کہ اتنی رات کے وقت کیا مسئلہ ہے......؟''

''وہ نذیراں! تم گھر کی پرانی اور وفادار خادمہ ہو۔ اس گھر کی ریت روایت' آن بان سب جانتی ہو۔ آن اور وقار کی بات آ جائے تو میں نے کبھی بڑی سے بڑی قربانی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ بتول کے آ جانے سے اس گھر کی تہذیب و روایت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اگر اسے پناہ نہ دی جائے تو یہ بھی ہماری روایت کے خلاف ہے۔ لوگوں کے مسائل کا حل ڈھونڈنے والی صادقہ بیگم روزِ محشر کیا منہ لے کر اللہ کے سامنے کھڑی ہوگی کہ ایک کمزور بے

سہارا لڑکی کو ہم پناہ نہ دے سکے۔ اور اگر اسے یہاں رکھیں تو کس طرح اس کی حفاظت کریں۔ کانچ کے برتن جس قدر حسین ہوتے ہیں اتنے ہی نازک بھی ہوتے ہیں۔ قیمتی بھی ہوتے ہیں۔ میں لوگوں کی زبان پر اپنے لئے سوال نہیں چاہتی۔ بتول کا بھائی' ماں کوئی الزام یا کوئی بہتان ہم پر لگا سکتے ہیں کہ ہم نے لڑکی کو اغوا کر کے رکھا ہے یا اور کچھ تو ہماری تو عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس سنگین صورتحال سے نمٹنے کے لئے درمیان کا راستہ ہم نے تلاش کیا ہے۔''

وہ چپ ہو گئیں تو میں نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ کیا بیگم صاحبہ!......؟''

''ہم نے بتول کی شادی کا فیصلہ کیا ہے اور میاں صاحب کو اس شادی پر راضی کر لیا ہے۔ بتول کو راضی کر لیا ہے۔ اس سے بڑی قربانی ہم نہیں دے سکتے تھے۔ سو ہم نے اپنے وقار اور نام کے لیے یہ کٹھن راستہ پسند کر لیا ہے۔ اب تم ہمارا ساتھ دو۔ کل سب کو جمع کرو۔ دوپہر کا کھانا سب کے لیے تیار کراؤ۔ ہم یہ فیصلہ جواب کی شکل میں سب کو سنائیں گے۔ کل شام پانچ بجے نکاح ہوگا۔''

انہوں نے روانی سے سب کچھ کہا اور چلی گئیں۔ نہ میری ہاں سنی اور نہ ناں۔ میرے حلق میں حیرت کا گولہ سا پھنس گیا۔ میں سکتے میں آ گئی کہ یہ کتنا غلط اور ظالمانہ فیصلہ ہے۔ اسے میاں صاحب نے مان لیا مگر کیوں... ؟ اور بتول نے بھی کیا بھول کر بھی؟ آئینہ نہیں دیکھا۔ کبھی اپنی زندگی کے سال مہینے نہیں گنے۔ میں یہ فقط سوچ کر ہی رہ گئی۔ تم سے پوچھ نہیں سکی۔''

''تم پوچھ بھی لیتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اس رات میں کس قدر اکیلی اور دکھی تھی۔ اگلے دن میرا نکاح ہونے والا تھا۔ بیگم صاحبہ کا بہت بڑا احسان میرے سر چڑھنے والا تھا۔ میں روئی بھی اور ہنسی بھی۔ دنیا میں کہیں پناہ جو نہیں تھی اور پھر بیگم صاحبہ نے اتنی بڑی قربانی میری خاطر دی تھی میں تو عمر بھر کے لیے ان کی غلام بن گئی تھی۔ اماں نذیراں......'' وہ دھیرے دھیرے بولی۔

''پگلی کوئی قربانی نہیں تھی وہ۔ سب کچھ انہوں نے اپنی گردن اونچی رکھنے کے لیے کیا۔ ہمیشہ کے حکم کے تابع شوہر کے کہیں چلے جانے کا انہیں رتی برابر بھی خوف نہیں تھا۔ تو بتا

میاں صاحب نے ایک لمحہ بھی تجھے دیا۔ بیگم صاحبہ کی موت کے بعد بھی وہ ان کی محبت میں سے تجھے وہ لمحہ نہیں دے سکے۔ پھر قربانی کا ہے کی۔ یہ تو ہٹ دھرمی تھی مگر محلے میں واہ واہ ہو گئی تھی۔ کتنی ہی مدت تک پورا ارد گرد کا علاقہ ان کی بڑائی اور عظمت کے گن گاتا رہا اور تجھے کیا ملا؟ بول......؟'' اماں نذیراں طنز بھرے جملے اس پر پھینکتے ہوئے بولی۔

''مجھے وہ لمحہ ملا تھا جب میں نے میٹنگ ہال میں کاغذ پر انگوٹھے لگائے تھے۔ میاں صاحب کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا تھا۔ سفید کرتے شلوار میں وہ میرے برابر بیٹھی بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی خوشی' کوئی امنگ اور کوئی رنگ نہیں تھا۔ میری جیسی کم عمر بیوی کو پانے کی مسرت جو کسی مرد کے لاکھ چھپانے پر بھی نہیں چھپتی وہ میں نے دیکھنے کے لئے دوپٹے کے کنارے سے ٹیڑھی نظریں کی تھیں۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اماں نذیراں تو بھی تو دیکھ رہی تھی۔ وہاں موجود تھی۔ تو نے ہی تو مجھے لا کر وہاں صوفے پر بٹھایا تھا۔ اس کمرے میں پہنچایا تھا۔ اور پھر تو مٹھائی تقسیم کرنے چلی گئی تھی۔ بیگم صاحبہ تیرے جانے کے بعد میرے پاس آئی تھیں۔ تو جانتی ہے کہ انہوں نے مجھے کیا کہا تھا؟'' اس نے دکھ سے ہنس کر پوچھا۔

''مجھے وہ بتا کر تیرے پاس تھوڑا آئی تھیں اور پھر تو نے کون سا بتایا کبھی کچھ......''
اماں نے گلہ کیا۔

''اماں نذیراں کیا بتاتی میں' کسی کو بتانے کو تھا ہی کیا' یہ بتاتی کہ بیگم صاحبہ یہ کہنے آئی تھیں کہ دروازہ اندر سے بند کر کے سو جاؤ۔ سونے سے پہلے شکرانے کے نفل ضرور پڑھ لینا اور ہاں میاں صاحب کی درازئ عمر کی دعا ضرور کرنا۔''

''یہ کہنے آئی تھیں اور تم نے مان لیا۔ شادی کی رات کیا ایسی ہوتی ہے؟ بس جیسا میرا یقین تھا۔ وہی کیا بیگم صاحبہ نے۔ تمہیں اپنے شوہر سے تو بات کرنی چاہئے تھی اور انہیں دیکھو کہ کاغذ پر دستخط کر کے شوہر بن بیٹھے۔ باقی شوہر کے فرائض کیا ہوتے ہیں یہ انہیں کبھی یاد نہیں آیا۔''

''کبھی نہیں۔ میں جان ہی نہیں سکی کہ شوہر کیا ہوتا ہے؟ وہ کبھی میرے پاس ہی نہیں آئے۔ ان کے قریب جانے کی مجھے نہ اجازت تھی اور نہ ضرورت۔ کہنے کو ولیمے کا کھانا بھی محلے والوں کو کھلایا گیا۔ جس شوہر نے بیوی کو دیکھا بھی نہ ہو اس کا ولیمہ کیسا ......؟ میں ساری

رات بہت روئی تھی۔ یہ سوچ کر کیا شادی ایسے ہوتی ہے۔ میں ایک کوارٹر سے کمرے تک کے سفر میں شادی شدہ ہو گئی۔ ایک ہلکی سی امید سے میں کمرے سے باہر نکل کر ان کے کمرے کے دروازے سے چپک کر کھڑی ہوئی تو اندر سے شوخ محبت بھری شرارتوں کا اظہار باہر صاف سنائی دے رہا تھا۔

شرگیں لہجے میں منت سماجت بھی' قہقہے تھے' لجایا لجایا تبسم تھا اور پھر چوڑیوں کے ٹوٹنے کا شور بھی تو تھا۔ میرے اندر جیسے ڈھیر ساری چوڑیاں اتر گئیں۔ میرا دل چھلنی ہو گیا۔ کیا حیثیت تھی میری یہ جان کر میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ قسمت اگر اچھی ہو تو کیا جوانی اور کیا بڑھاپا' سب ایک سے ہیں۔''

''خود تو وہ سدا سہاگن ہی رہیں۔ تمہارے ساتھ ظالمانہ سلوک کا انہیں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ میاں صاحب سے ان کا رشتہ گہرا اور مضبوط تھا۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ تو نے کبھی ان سے شکوہ ہی نہیں کیا۔ شوہر بوڑھا ہو یا جوان ہوتا تو شوہر ہے۔ اپنی مرضی سے تجھے میاں صاحب کی بیوی بنایا اور پھر ایک دن بھی اس رشتے کو قبول نہیں کیا۔''

''میں تو اس وقت حیرت میں آ گئی تھی جب میاں صاحب نے میرے بھائی سے گرج دار آواز میں یہ کہا تھا کہ اب بتول میری بیوی ہے لہٰذا ملنا چاہو تو ملنے آنا۔ دوسری صورت میں کبھی یہاں قدم نہ رکھنا۔ میں نے ان کے منہ سے بھی پہلی اور آخری مرتبہ یہ لفظ سنا تھا اور میں اس پر ہی خوش اور مطمئن ہو گئی تھی۔ شاید میں نے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا اور دل سے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔

صرف اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ بیگم صاحبہ کی شفیق اور مہربان آنکھیں ہر وقت مجھ پر ہی جمی رہتی تھیں۔ میں تو پوری طرح پلکیں اٹھا کر ارد گرد دیکھتی بھی نہیں تھی۔ ان حصوں میں مجھے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی جہاں بیگم صاحبہ اور صاحب جی اٹھتے بیٹھتے تھے۔

''تیرے صبر اور حوصلے کی تو میں اپنی بہو کو مثال دیتی تھی۔ ہم رات کو دیر تک تیرے حالات پر کڑھتے تھے۔ مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ تجھے معلوم ہے ایک رات میری بہو کہنے لگی۔
''اماں! کاش بتول پڑھی لکھی لڑکی ہوتی تو کسی کی محتاج نہ ہوتی۔ اپنا پیٹ بھر لیتی۔ تعلیم کی اہمیت تو ہے نا۔ ہاں! مگر اس کے ظالم باپ نے اس بے چاری کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔''
مجھے اپنی بہو کی یہ بات اتنی پسند آئی کہ میں کیا کہوں؟ مگر افسوس کہ تیرے لیے ہم دونوں

باتوں کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔'' اماں نذیراں جمائیاں لیتے ہوئے بولی۔

بتول کو احساس ہو گیا کہ بوڑھی اماں نذیراں اب پوری طرح نیند کے چنگل میں ہے۔ اس نے اسے لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔

''تم بھی سو جاؤ بیٹی! صبح قل ہیں۔ سویرے ہی وہ منیجر آ جائے گا۔ دنیا داری تو نبھانی ہے۔'' اماں نذیراں نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں بھی سو جاؤں گی۔ تم میری فکر نہ کرو۔ کہانی دہرا کر سو جاؤں گی۔ ایک زمانے کی جاگی ہوئی ہوں۔ جسم، جان کی تھکن سے چور چور ہوں۔'' وہ بڑبڑائی۔ کچھ ہی دیر میں اماں نذیراں گہری نیند سو گئی تو وہ اپنی کہانی کے ساتھ تنہا رہ گئی۔

تنہا تو میں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ رہی۔ یہاں بھی سب کے ہوتے ہوئے بھی میں تنہا تھی۔ نکاح کے بعد ایک سے دو ہوتے ہیں مگر میں تب بھی تنہا رہی۔ کس قدر دل کو بہلا کر میں ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ جب بیگم صاحبہ نے مجھے بلوایا تھا۔ ویسے ہی ملازم سخاوت سے پوچھ لیا تھا کہ وہاں کون کون ہے؟ یہ جان کر کچھ مسرت سی ہوئی تھی کہ وہاں میاں صاحب بھی ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ میاں صاحب صرف صادقہ بیگم کے پاس ہوتے ہیں۔ صرف ان کی ذات کے لیے ہوتے ہیں۔ میاں صاحب پائیدار اور مضبوط سیمنٹ سے جس طرح اینٹ سے اینٹ جوڑی جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی صادقہ بیگم کی عمارت سے جڑے تھے۔ انہیں کوئی ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ جان کر ہی صادقہ بیگم نے اتنا صبر آزما فیصلہ کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بتول انسان تو کیا جل پری بھی بن جائے تو میاں صاحب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کی مرضی کے بغیر تو وہ سچ مچ پلکیں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔ تبھی تو ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد بھی مجھے صرف صادقہ بیگم کا ساتھ ملا۔ انہوں نے کچھ بڑے بڑے سامان سے بھرے ہوئے شاپرز میری طرف بڑھائے اور کہا۔

''یہ کپڑے، زیور، میک اپ کا سامان اور دوسری چیزیں تمہارے لئے ہیں۔ انہیں استعمال کرنا۔ ہم لوگ آن بان والے ہیں۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ میاں صاحب کی دوسری بیوی تو ملازمہ لگتی ہے۔ لہٰذا طریقے سے رہا کرو۔'' انہوں نے انتہائی میٹھے اور دھیرے دھیرے بہتے جھرنوں کی مانند کچھ جملے میرے کانوں میں انڈیل دیے اور میں سکتے میں آ گئی۔

''میں کس کے لیے اور کیوں سجوں، سنوروں؟ میرا سہاگ، جو میرا زیور ہے وہ تو

میرے پاس نہیں ہے پھر میں کیا کروں ان سب چیزوں کا۔'' مگر یہ باتیں میرے اندر ہی رہ گئیں۔ میں وہیں کھڑی رہی اور وہ دونوں اٹھ کر میرے برابر سے باہر نکل گئے۔ ایسے میں بھی اماں نذیراں نے صرف تم نے میری آواز سنی تھی اور مجھے گلے لگا کر کہا تھا کہ ''بوڑھے برگد کے درخت سے تجھے بھلا کیا ملے گا۔ بس سمجھ لے کہ تو بن بیاہی ہے۔ تو نا سمجھ ہے۔'' اور میں پھر سے صابرہ شاکرہ بن کر اپنی دنیا میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے خراٹے بھرتی اماں نذیراں سے ایسے بات کی جیسے وہ جاگ رہی ہو۔ میری کہانی سن رہی ہو۔

میں نے حالات سے سمجھوتا ہی تو کر لیا تھا۔ نہ کرتی تو کہاں جاتی؟ کون تھا میرا؟ کہنے کو بھائی تھا۔ ایک ہی باپ کی اولاد مگر وہ بھی جان کا دشمن تھا۔ بیگم صاحبہ نے اچھا کیا تھا یا برا مگر میرے لئے تو بہتر ہی تھا۔ میں پناہ میں تھی۔ روٹی اور کپڑا مجھے مل رہا تھا۔ صرف دلی خوشی اور سکون کے نہ ہونے سے تو کوئی نہیں مرتا۔ میں بھی زندہ تھی۔

بس وقت سے پہلے سمجھدار اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ نہ کوئی امنگ تھی اور نہ ارمان۔ وہ شام تو میں کبھی نہیں بھول سکتی جب بارش کے بعد کتنا دھلا دھلا اور نکھرا نکھرا ماحول تھا۔ لان میں سبزے پر عجب نکھار تھا۔ ایسے میں بیگم صاحبہ سبز ساڑھی پر سفید گجرے بالوں میں سجائے میاں صاحب کے ساتھ لان میں گیلی گیلی گھاس پر ننگے پاؤں چل رہی تھیں۔ میاں صاحب کی آنکھوں میں ان کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ جب کہ بیگم صاحبہ کے انداز میں فاتحانہ غرور تھا، شان بے نیازی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس چلی گئی تو جیسے صادقہ بیگم نے میاں صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ لمحہ ضائع کیے بنا فاصلے پر رکھی کین کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ میرے دل میں درد سا جاگا۔ بیگم صاحبہ نے مسکرا کر میری جانب توجہ کی۔

''ہاں بتول! کیا بات ہے؟''

''جی چائے آپ اندر پئیں گی یا باہر؟'' میں نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

''یہاں باہر ہی موسم اچھا ہے اور تم بھی ہمارے ساتھ آؤ اور دیکھو کس قدر خوبصورت موسم ہے۔'' کمال ہوشیاری سے انہوں نے محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا۔ کہہ دینے میں کیا حرج تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ میاں صاحب صرف انہی کے میاں ہیں۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ آئی۔ کچھ دور جا کر میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو میاں صاحب کرسی سے اٹھ کر دوبارہ بیگم صاحبہ کے پاس آ گئے تھے اور پہلے سے زیادہ محبت کے رنگ ان کے چہرے پر

نمایاں تھے۔

میں نے وہ شام درد کی شدت میں گزاری۔ میں کیسی سہاگن تھی کہ جس کا سہاگ ہر بات سے لاعلم اور لاپروا تھا۔ بیگم صاحبہ نہ جانے کیوں یہ احساس دلاتی رہتی تھیں کہ میاں صاحب تمہارے شوہر ہیں۔ ان کی صحت اور درازی عمر کی دعا مانگا کرو۔ شاید وہ بہت زیادہ مفاد پرست تھیں۔ میری دعاؤں سے اپنے سہاگ کی حفاظت چاہتی تھیں۔ کتنی سفاکی تھی کہ میرے شوہر صرف میری دعاؤں تک محدود تھے۔ میں نے شکایت کے لیے لب کھولنے چاہے تو انہوں نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ ”شوہر مٹی کا بھی ہو تو عورت اللہ سے اس کی صحت اور سلامتی مانگتی ہے۔“

گویا یہ وہ جواب تھا جس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اماں تمہاری بہو نے میرے سامنے تم سے کہا کہ یہ شادی جائز نہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے کسی عورت کو اس کا خاوند چھو کر بھی نہ دیکھے تو کیا وہ شادی رہتی ہے اماں؟“

اور اماں نذیراں کے چہرے پر مشکوک سے جواب کی پرچھائیاں دیکھ کر میں وہاں سے آ گئی۔ میرے اندر سوالات سر اٹھانے لگے۔ کیا میں میاں صاحب کی بیوی ہوں؟ یا اس کے سوا کچھ نہیں کہ کاغذ پر میرے ساتھ ان کا نام لکھا ہے؟ مگر اتنے عرصے بعد بھی میرے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ میں اس وقت بھی صرف بتول تھی...... تنہا اور بے بس۔ آج بھی اسی طرح ہوں۔ اب تو میاں صاحب اس دنیا کے سفر پر جا چکے ہیں جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ ”ہاں اب تو گلہ کرنا بیگم صاحبہ جیسی دوہری شخصیت کی مالک سے گلہ شکوہ کرنا انتہائی فضول تھا۔ وہ تو عجیب طریقے سے مجھے اپنے اشاروں پر چلاتی رہیں۔ نہ جانے کس احساس کو تسکین دینے کے لیے انہوں نے میاں صاحب کی مجھ سے شادی کرائی تھی۔ کیا صرف محلے کی خواتین کے سامنے سر اونچا کرنے کے لیے یا پھر شوہر کی آزمائش مقصود تھی؟ میاں صاحب کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ تو پوری طرح بیگم صاحبہ آپ ہی کے تھے۔ آپ کے ڈھلکے ہوئے جسم اور جھریوں زدہ چہرے پر ہی عمر بھر فدا ہوتے رہے۔ کبھی میری جانب ایک نگاہ نہ ڈالی۔ وہ تو پوری طرح ان کی ذات کے قلعے میں محصور تھے۔ پھر کیوں انہیں آزمائش میں ڈالا ...؟ کیا شوہر کو فتح کرتے کرتے مجھے بھی تسخیر کرنے کی خواہش تھی؟ یہ باتیں کب میں نے آپ سے پوچھیں؟ میں پوچھ ہی نہیں سکتی تھی؟ کیوں کہ میرے پاس یہ حق

تھا ہی نہیں۔

ایسے سرد اور مردہ جذبوں کے ساتھ کتنا بہت سا وقت گزار دیا تھا میں نے۔ پھر اماں نذیراں نے میرے جذبوں کو حرارت کی زندگی سے جوڑ دیا۔ مجھے اللہ کی بندی بنا دیا اور ڈپٹ کر کہا کہ صرف اللہ کی ہو جاؤ۔ سونپ دو خود کو اللہ کو۔ اسی کے لیے جیو۔“ میں نے دل میں تکبیر سنی‘ میرے بدن کا رواں رواں جاگ اٹھا۔ جذبے بیدار ہو گئے مگر ان میں وہ بھوک اور تڑپ نہیں تھی جو عرصے سے مجھے تڑپا رہی تھی‘ ترسا رہی تھی۔ بلکہ وہ سکون اور اطمینان تھا کہ میں لاتعلق ہو گئی۔ میاں صاحب سے۔ بھول گئی کہ وہ کون ہیں؟ اس لیے تو مجھے آج کوئی رنج اور دکھ نہیں۔ کیوں کہ میرا ان سے بالکل غیروں جیسا رشتہ ہی تھا۔ جیسے اماں نذیراں کو دکھ ہوا۔ محلے کے دوسرے لوگوں کو ہوا۔ بالکل اسی طرح مجھے ہے۔ میں کیوں روؤں؟ حد سے زیادہ دکھ کا اظہار ہو ہی نہیں سکا۔ میں صادقہ بیگم تو نہیں کہ میاں صاحب کی جدائی میں پاگل ہو جاؤں۔ میرے لیے تو وہ صرف میاں صاحب ہی تھے۔ میاں تو نہیں تھے۔ میں نے تو نماز میں‘ سجدے میں‘ دعاؤں میں سچے رب کو پا لیا تھا۔ اس کی چاہت میں خود کو گم کر لیا تھا۔ تبھی تو بیگم صاحبہ اور صاحب جی کی باتیں‘ قہقہے‘ چہلیں‘ چہکاریں اور سرگوشیاں مجھے کچھ بھی تو برا نہیں لگتا تھا۔ میں نے جذبوں کی بھٹی کا منہ بند کر دیا تھا۔ اللہ کے نام کا بھاری پتھر رکھ کے ہمیشہ کے لیے کمزور جذبوں کو دفنا دیا تھا۔

جب بیگم صاحبہ اتنی عمر میں کھٹا میٹھا کھانے لگیں‘ چھوئی‘ موئی بن گئیں‘ تب بھی میرے اندر نہ کوئی جذبوں کا سوتا پھوٹا اور نہ کوئی ہوک اٹھی۔ میاں صاحب کسی پہلی دفعہ ماں بننے والی عورت کی طرح ان کے چاؤ چوچلے اٹھاتے تو میں سیدھے سبھاؤ کام میں مصروف ہو جاتی۔ خود بخود انجان سی بن جاتی۔ شرمیلی لجاجت سے بھری سرگوشیوں پر بھی مجھے کچھ نہ ہوتا۔ میرے لئے کچھ بھی حیران کن نہیں تھا۔ ان دونوں کے لیے میں غیر اہم تھی اور میرے لیے وہ دونوں۔

صادقہ بیگم بالکل نئی سی ہو گئی تھیں۔ میٹنگ ہال میں بھی برائے نام بیٹھتیں۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر اماں نذیراں بولے بنا نہ رہ سکیں۔ ”ایسے چوچلے تو پہلے بچے کی دفعہ بھی صادقہ بیگم نے نہیں کیے تھے۔ بڑھاپے کی اولاد کے لیے تو حد سے زیادہ چوچلے کر رہی ہیں اور ایک تو ہے۔ تجھے تو کسی الماری میں رکھ کر بھول گئی ہیں۔“

میں نے ہنس کر کہا تھا کہ بھول جانے دے اماں۔ میں بھی سب کچھ بھول کر حقیقی رب کو یاد کرنے لگی ہوں۔"

"ٹھیک ہی تو کہا تھا میں نے۔ جوان بچوں کے ہوتے ہوئے کچھ خیال رکھنا چاہئے تھا۔ پھر جس کے یہ دن دیکھنے کا زمانہ تھا۔ اس کی پروا ہی نہیں تھی۔" اماں نذیراں شاید میری خود کلامی سے اٹھ بیٹھی تھیں۔

"ارے اماں تم جاگ رہی تھیں کیا.....؟"

"بس بڑھاپے میں نیند چڑیا جیسی ہی رہ جاتی ہے۔ تو بول بھی تو رہی تھی۔ کتنی رات گزر گئی ہے۔ سوئی نہیں جا سو جا۔" انہوں نے جماہی لی۔

"سو جاؤں گی اماں۔ پوری کہانی خود کو سنا ڈالوں پھر سو جاؤں گی۔ مدتوں سے جاگ رہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کہانی تو ختم ہوئی۔ تیری پھول سی زندگی ہے۔ آگے کی فکر کر۔ چھوڑ پرانی باتیں۔ اللہ ان دونوں کو معاف کرے۔ بڑا ظلم کیا ہے تیری ذات پر۔ جس روز ہسپتال میں آپریشن ہونا تھا میں نے طبیعت زیادہ خراب دیکھ کر انہیں یہ احساس دلایا تھا کہ کسی حق دار کا حق نہیں رکھتے۔ اللہ سختی دور کرے۔ اب تجھے کیا بتاؤں کہ میاں صاحب نے کس غصے سے مجھے یہ کہا کہ کیا یہ وقت ایسی باتوں کا ہے.....؟" میں چپ ہو گئی تھی۔ میاں صاحب پٹی سے لگے تھے۔ آپریشن کے لیے وہ چلی گئیں تو وہ بے چینی سے ٹہلتے رہے اور پھر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو کر صادقہ بیگم باہر آئیں تو وہ تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھے۔ بچہ اور زچہ دونوں ہی مر چکے تھے۔"

"بڑا مشکل وقت تھا وہ بھی۔" بتول نے لمبی سانس لی۔ "اف اس قدر سناٹا تھا۔ چاروں طرف پوری کوٹھی پر ویرانی کا پہرہ تھا۔ میاں صاحب کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ جان پہچان والے صادقہ بیگم کے قصیدے پڑھتے، تعریفیں کرتے تو وہ چپ چاپ آنسو بہاتے۔ کس قدر پراسرار شخصیت تھی صادقہ بیگم کی۔ ہر وقت مسکرانے والی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے والی، کسی کو بھی ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ دنیا کی کتنی بڑی فاتح ہیں۔ شوہر جیسی طاقت کو کس نرمی اور محبت سے انہوں نے فتح کر رکھا تھا۔ نہ جانے نرم مہربان نگاہوں کے پنجرے میں قید تھے یا میٹھی مسکان کے اسیر تھے مگر تھے مکمل طور پر قیدی۔ تبھی تو مرنے کے بعد بھی وہ باسی مہک سے لپٹے ہوئے تھے۔ آنگن

میں نو خیز کلی کی چٹک اور مہک سے بے خبر۔"

"اس میں کچھ قصور تیرا بھی ہے۔ میں نے مانا کہ وہ بیگم صاحبہ کے خیال سے لپٹے رہے لیکن تو نے بھی یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ ان کے پاس جائے، حال پوچھے، کھانے پینے کا خیال رکھے، تو نے تو بس جائے نماز پکڑ لی تھی۔ کبھی وہ بھول بھٹک کر اگر اس کمرے تک آتے بھی تو چپ چاپ لوٹ جاتے۔ تجھے تو ان کے قدموں کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔"

"ہاں! تو کیوں آتی؟ کیوں میں توجہ دیتی؟ میں ان سے لاعلم تھی۔ اماں نذیراں انسان جانی پہچانی چیزوں کی جانب توجہ کرتا ہے اور پھر میری نماز سچے محبوب کی تمنا اور آرزو تھی۔ اس کی جانب توجہ کی تو پرسکون ہو گئی۔ جذبات کے منہ زور طوفان پر سکوت طاری ہو گیا۔ حقیقی اور سچا محبوب تو وہی ہے۔ تھوڑی سی محنت اور پیار سے مل جاتا ہے۔ جس کے لیے نہ ہار سنگھار کرنا پڑتا ہے اور نہ ناز و انداز۔ کسی غازے یا گجروں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کسی بند کمرے اور میٹھی سرگوشیوں کی طلب نہیں رہتی۔ خود کو اس کی محبت میں لپیٹ کر مصلے پر کھڑے ہو جاؤ۔ آنکھیں بند کر لو۔ لبوں کو جنبش بھی نہ دو۔ ہاتھ باندھ لو اور اسے پا لو۔ ہمیشہ کے لیے۔ دل کی گہرائیوں تک اس کی محبت اتر جائے گی۔ یہی تو محبوب کی حقیقی محبت تھی جو میں نے تھوڑی سی محنت اور محبت سے پا لی تھی۔ تیرے کہنے پر جتنی بھی میں محنت کرتی میاں صاحب نہ ملتے۔ اگر مل بھی جاتے تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا..... تھوڑی سی خوشی، تھوڑا سا سکون۔ وہ بھی عارضی۔ تھوڑی سی مدت کے لیے۔ میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اماں نذیراں! یہ گھر میرا نہیں بلکہ یہاں کی کوئی بھی چیز میری نہیں۔ اس لیے میں نے اس رشتے کو اپنایا ہے جو ازلی ہے اور مستحکم ہے۔ دیکھ اماں نذیراں! دیکھ کیا وہ ملال ہے میری آنکھوں میں جو اس وقت میاں صاحب کو کھونے کے بعد صادقہ بیگم کی آنکھوں میں ہوتا۔ کیا وہ دکھ ہے میرے اردگرد جو صادقہ بیگم کو ادھ موا کر دیتا.....؟ نہیں دیکھ سکتی۔ اماں تو اس لیے کہ میں نے اس عارضی رشتے کی خاطر مستقل رشتے کی ڈوری نہیں توڑی۔ سب کچھ فنا ہونا ہے۔ میں نے یہ فنا کا رشتہ چند دن کے لیے بھی اپنا لیا ہوتا تو، تو، تیری بہو اور سب لوگ یہ کہتے کہ کتنی احسان فراموش ہے، خود غرض ہے۔ کیسی کمین ہے، نیچ ہے، بے چاری صادقہ بیگم کے شوہر کو غلام بنا لیا۔ ایسی باتیں میں کیسے برداشت کرتی.....؟"

"یہ ایسی باتیں تو کیوں سوچ لیتی ہے بتول!؟" اماں نذیراں نے اٹھ کر لاڈ سے

گلے لگایا۔

''یہی بات تو اقبال بھائی نے مجھے اسی طرح گلے سے لگا کر کی تھی۔ کس بری طرح رو رہا تھا وہ۔ اماں کے مرنے کے بعد اسے میری یاد نے سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔ وہ مجھے لے جانے آیا تھا مگر پھر میرے ہاتھ سے کھانا کھا کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ کراچی جا کر اس نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔''

''کر لے گا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پھر ویسے بھی تو نے اسے مطمئن کر کے بھیجا ہے۔ اس وقت تو وہ میاں صاحب کو زندہ دیکھ کر گیا تھا۔''

''ہاں میاں صاحب اس کے آنے سے چار روز پہلے ہی تو عمیر اور عامر سے مل کر امریکہ سے واپس آئے تھے۔ بجھے بجھے سے' اداس اداس' چھ مہینے میں نے تیرے اور تیری بہو اور ملازموں کے ساتھ گزارے تھے۔''

''تو کیوں پرانی باتیں یاد کر رہی ہے۔ ذہن پر خواہ مخواہ کا بوجھ' ساری رات ہی تو نے جاگ کر گزار دی۔ ابھی کچھ ہی دیر میں اذان ہونے والی ہے۔ لیٹ جا کمر سیدھی کر لے۔''

''اچھا لیٹ جاتی ہوں۔ لیکن تم مجھے بولنے سے نہ روکو۔ میرے لیے ایک کپ چائے بنا لاؤ اور پھر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ میں چائے لاتی ہوں۔ کچھ کھانے کو لاتی ہوں اور ذرا کوارٹر میں بھی بچوں کو دیکھ آؤں۔'' اماں نذیراں یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

''میاں صاحب! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا سوگ نہیں منا سکتی۔ مگر میں بھی کیا کروں؟ میرا تم سے رشتہ ہی کیا ہے؟ ظاہری' باطنی کوئی بھی تو نہیں۔ امریکہ سے لوٹ کر بھی تو آپ وہ رشتہ مضبوط نہ کر سکے جو بیگم صاحبہ کے ایک اشارے پر آپ نے مجھ سے جوڑ لیا تھا۔ وہ کتنا کمزور اور کچا تھا۔ امریکہ سے لوٹ کر تو میری طرف آتے۔ میں منتظر بھی تھی۔ آپ کچھ تو فاصلہ کم کرتے مگر آپ گاؤں شہر کی بھول بھلیوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی لیے تو آپ کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ دل کا درد کب آپ کے دل میں جگہ پکڑ گیا۔ بند کمرے میں رہتے رہتے دل کے دروازے بھی مقفل کر ڈالے۔ پھر بتایئے میں کیا کرتی۔ میں تو کمزور اور غیر اہم تھی جب کمرے کے دروازے نہ کھلوا سکی تو' دل کے دروازے پر دستک کیسے دیتی؟ اجنبی اور پرائے

گھروں میں بنا اجازت داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ میں نے اس لیے یہ خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب یہ گھر اس کے سب کمرے کھلے ہیں مگر میں پھر بھی بنا اجازت داخل نہیں ہو سکتی۔ مجھے جانا ہے اور ہمیشہ کیلئے جانا ہے۔ یہ سب آپ کے اور بیگم صاحبہ کے بچوں کا ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔

☆......☆......☆

''آ جاؤ آ جاؤ منشی صاحب! بیگم صاحبہ جاگ رہی ہیں۔'' اماں نذیراں منشی کو بلاتی ہوئی اندر آئیں تو بتول نے کمرے کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی اور وحشت کو دیکھا۔

''سلام بیگم صاحبہ!'' وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔

بتول نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ منشی کسے بیگم صاحبہ کہہ رہا تھا؟

''ارے منشی تم سے' کچھ کہنے کے لیے منہ اندھیرے آیا ہے۔'' اماں نذیراں نے میری حیرت کو کم کیا اور چائے کا کپ بسکٹ کی پلیٹ میرے دائیں طرف والی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

''کیا کہنے آئے ہو۔ بولو بیٹا۔ تمہیں تو قل کا انتظام کرنا تھا۔'' اماں نذیراں نے اس سے کہا۔

''جی! لیکن اس وقت میں جو کچھ بتانے آیا ہوں وہ بہت ضروری تھا۔ قل سے بھی ضروری۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''اچھا بولو کیا بات ہے......؟'' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس حیثیت سے کسی سے مخاطب تھی۔

''دراصل بیگم صاحبہ! رات ایک بجے کے قریب میں سونے کے لیے لیٹا تو تھکن کی وجہ سے فوراً نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں صاحب جی کو دیکھا۔ وہ پریشان تھے۔ کہہ رہے تھے کہ۔'' وکیل کو بیگم صاحبہ سے ملواؤ۔ جلدی کرو۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آپ کو بتانے چلا آیا۔'' آپ وکیل سے فوراً مل لیں۔ میں وکیل صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔''

''کیوں؟ کس لیے؟ کیا کام ہے وکیل سے؟ اور وکیل کو مجھ سے اور کیسی بچوں جیسی بات ہے یہ کہ صاحب جی نے تم سے خواب میں یہ کہا ہے۔'' اسے کچھ بھی اچھا نہ لگا۔ حلق نہ

جانے کیوں کڑوا ہو گیا۔ چہرے کی بیزاری چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر چھپائی۔

''ارے قبر کی تنہائی اور گہرائی میں سب بھولے سبق یاد آ جاتے ہیں۔ کیا حساب دیں گے صاحب جی۔ موا وکیل یاد آ گیا وہاں بھی کیس لڑنے کو۔'' اماں نذیراں بھی قطعی ناگواری سے بولیں۔

''اچھا فی الحال کچھ ضروری نہیں ہے۔ مجھے بھی تو خواب میں آ کر کچھ کہیں۔'' نہ جانے بتول کیوں مذاق اڑا رہی تھی منشی کا۔

''اری بچی! وہ تمہیں بھی نظر آ جائیں گے اگر سو جاؤ تو۔ جاگتے میں تو خواب آتے نہیں۔''

''ٹھیک ہے منشی جی! آپ جائیں۔ قل کا انتظام کریں۔ وکیل صاحب سے بھی میں مل لوں گی۔ آپ کہہ دیں وکیل صاحب کو۔'' اس نے جان چھڑانی چاہی۔

''سنو مسجد سے محلے والوں کے لیے اعلان ضرور کرانا۔'' اماں نذیراں نے جاتے ہوئے منشی کو روک کر کہا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور چلا گیا۔ بتول نے چائے ختم کی۔

''اماں نذیراں! میں ایک دو دن بعد نہ مل لوں وکیل صاحب سے۔''

''ارے مل ملا لے۔ اس کی بھی سن لے۔ آخر کو میاں صاحب نے خواب میں بتایا ہے۔'' اماں نذیراں نے لاپروائی سے کہا۔

''اقبال بھائی سے رابطہ ہو تو میں اسے کہوں کہ مجھے آ کر لے جائے۔''

''ہوں لیکن تیرا گھر تو یہی ہے۔ یہاں کون رہے گا؟'' اماں نذیراں سوچتے ہوئے بولیں۔

''نہیں اماں جو حق زندگی میں نہیں ملا وہ میرا نہیں ہے۔ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کی ہر چیز ان کے بچوں کی ہے۔''

''تو بھی ان کی بیوی ہے۔ پہلی نہ سہی دوسری تو ہے۔''

''یہ بات نہ کیا کرو اماں نذیراں۔ میرا خیال ہے اذان ہو رہی ہے۔ میں نماز پڑھ لوں۔'' بتول نے لاتعلقی سے کہا اور نماز کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں بھی میٹنگ ہال میں چادریں بچھا کر گٹھلیاں رکھ دوں۔''

''میں نماز پڑھ کر خود بلا لوں گی۔ اطمینان سے کام کرو۔'' بتول نے کہا۔

میٹنگ ہال عورتوں سے بھرا تھا۔ گٹھلیاں پڑھی جا رہی تھیں۔ ایک مسلسل مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کا شور جاری تھا۔ وہ بھی خاموش بیٹھی سب کی نظروں کی زد میں تھی۔ سب کی نظریں بار بار اس کی جانب اٹھتیں۔ کسی میں حقارت' کسی میں ہمدردی تھی اور کسی میں طنز۔ وہ سب کی سب آج بھی صادقہ بیگم کے قصیدے پڑھتی تھیں۔ انہیں یاد کر کے روتی تھیں۔ وہ تھیں بھی تو بہت سخی۔ کھلے دل اور کھلے ہاتھوں والی۔ وقت بے وقت کچھ نہ کچھ تقسیم کرتی رہتی تھیں۔

غریبوں کے گھر کا چولہا اکثر و بیشتر ان کی وجہ سے چلتا تھا۔ ادھار نہیں بس ویسے ہی رقم دے دیا کرتی تھیں۔ بتول نے ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے دیکھا تھا۔ بس ایک اس کے معاملے میں ہی وہ پراسرار ہو گئیں۔ اتنا بڑا فیصلہ کر کے اس کا حق ادا نہ کر سکیں۔ اس نے ان سے کچھ اور نہیں پایا۔ اس لیے اس میں اور محلے کی دوسری عورتوں میں فرق تھا۔ وہ صادقہ بیگم کے میاں صاحب کے قل کی گٹھلیاں پڑھنے آئی تھیں۔ ان سے محبت اور وفا کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس نے چادر سنبھالی اور اٹھ کر باہر آ گئی۔

''کیا ہوا بتول؟'' اماں نذیراں جو ڈھیر ساری گیلی پلیٹیں خشک کپڑے سے صاف کر رہی تھی بولی۔

''کچھ نہیں' میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

''ابھی سے۔ ابھی تو فاتحہ ہونی ہے۔ کھانا کھلانا ہے سب کو۔'' اماں نذیراں نے اطلاع دی۔ حالانکہ یہ سب کچھ تو وہ جانتی تھی۔

''تم سب سنبھال لینا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' بتول نے کہا۔

''سب باتیں کریں گی۔''

''باتیں تو کریں گی کیوں کہ وہ مجھے نہیں جانتیں۔ صادقہ بیگم کو جانتی ہیں۔ ان کے میاں کے لیے کلمہ پڑھ رہی ہیں۔ میں میاں صاحب کو جانتی ہی نہیں تو یہاں بیٹھ کر کیا کروں گی؟'' اس نے تیزی سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

''دیکھ بتول بیٹی! کچھ زمانے کی ریت روایت ہوتی ہے۔ سب کی نظر میں تو تم میاں صاحب کی بیوی ہو۔ تمہیں اسی رشتے کے تحت لوگوں سے ملنا ملانا ہے۔'' اماں نذیراں

اس کے پیچھے ہی کمرے میں آتے ہوئے بولیں۔

''میں اس رشتے کو نہیں جانتی۔ ہاں احترام کرتی ہوں۔ اس گھر کا۔ اس گھر کے اصل وارثوں کا اس لیے کہ مجھے مشکل میں پناہ ملی تھی اس گھر میں۔ بیگم صاحبہ نے بہت بڑی قربانی دی۔ میں یہ احسان عمر بھر یاد رکھوں گی۔ میں پڑھی لکھی نہیں ورنہ کچھ لکھتی۔ کچھ اور بہتر طریقے سے اظہار کرتی۔ جاہل ان پڑھ ہوں بس سادگی سے ہی یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے وہ نہ سمجھا جائے جو میں نہیں ہوں۔''

''تم نفرت سے تو نہیں کہہ سکتیں کیونکہ تم نے تو کبھی جلن اور حسد نہیں کیا۔ پھر اب کیوں؟''

''اس لیے اس لیے اماں نذیراں کہ میں اب بھی ویسے ہی لاتعلق بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی حسد اور جلن نہیں۔ یہ دونوں چیزیں تو میرے قریب پھٹک بھی نہیں سکتیں۔ کیا تم نے کبھی مجھے سوتن کی شکل میں دیکھا ہے؟'' اس نے اماں نذیراں سے الٹا سوال کیا۔

''تمہاری ہر بات درست ہے۔ بس اس وقت تھوڑی سی دنیا داری کی بات ہے ورنہ لوگ کہیں گے کہ صادقہ بیگم نے کتنی بڑی قربانی دے کر جسے اس گھر کی عزت بنایا اسے اپنے شوہر کے مرنے کا ذرا افسوس نہیں۔''

''میں کیا کروں؟ جھوٹ بولوں۔ مجھے یہ حق میاں صاحب نے نہیں دیا۔ میں بے ایمانی نہیں کر سکتی۔''

''ارے کون کہتا ہے کہ تو جاہل ہے۔ بہت بڑی بڑی باتیں سوچنے لگی ہے۔ نہ جانے کون سی بے ایمانی کی باتیں کرتی ہے تو۔ تو اگر ان کی کچھ نہ لگتی تو وہ بیگم صاحبہ کے مرتے ہی تجھے نکال باہر بھی تو کرتے۔''

''ان کے مرنے کے بعد بھی تو انہوں نے مجھے کوئی مقام نہیں دیا۔ وہ بیگم صاحبہ کی ہی قید میں رہے۔ اصل میں بیگم صاحبہ نے میاں صاحب کی محبت آزمانے کے لئے ہی یہ سب کیا تھا۔''

''چلو جو بھی ہوا تمہاری لمبی عمر پڑی ہے۔ جوانی ہے۔ یہ گھر بار، روپیہ پیسہ ہے آگے کی سوچو فی الحال چند دن کی دنیا داری نبھانی ہے اور بس۔''

''اچھا بابا ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات نہیں ٹال سکتی کیونکہ تم واحد ہمدرد اور غمگسار

ہو میری۔ تم چلو میں آتی ہوں۔'' اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔

پھر اس نے ہال میں سب کے درمیان بیٹھ کر فاتحہ پڑھی۔ کھانا شروع کروایا۔ باہر مرد بھی کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ میاں صاحب کے چاہنے والے، محبت کرنے والے بری طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ کچھ دیر پلیٹوں اور چمچوں کا شور جاری رہا۔ جونہی شور میں کمی ہوئی منشی جی نے اماں نذیراں کی بہو نرگس سے کہا کہ کچھ لوگوں کو بیگم صاحبہ سے افسوس کرنا ہے انہیں ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔

نرگس نے اس سے آ کر کہا تو اس نے کہلا بھیجا کہ میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی کھڑی ہو سکتی ہوں جسے جو کہنا ہے کہہ دے۔ کچھ دیر بعد منشی جی نے خود دروازے میں کھڑے ہو کر اس کی آمد کی اندر اطلاع کی۔ پھر سب نے فرداً فرداً افسوس کے نمائشی کلمات ادا کیے۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے اجازت چاہی۔ وہ پلٹنا چاہتی تھی کہ منشی جی نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! وکیل صاحب بھی آپ سے ملاقات چاہتے ہیں۔ صرف وہی ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔ آپ مل لیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور منشی صاحب کی ہمراہی میں اندر چلی آئی۔

''السلام علیکم بیگم صاحبہ!'' ایک بارعب سی شخصیت نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! آپ بیٹھیں۔'' اس نے اخلاقاً کہا۔

''بیگم صاحبہ! میاں صاحب کی وفات کا مجھے بہت صدمہ ہے لیکن اللہ کی رضا کے سامنے ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''جی آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے دھیرے سے بات کی حمایت کی۔

''دراصل مجھے انہوں نے ایک ذمے داری سونپی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وفات سے تین دن پہلے جب انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا تو انہوں نے مجھے بلایا تھا۔''

''جی! ہارٹ اٹیک مگر میں نے تو سنا تھا کہ معمولی سی طبیعت خراب ہے۔'' اس نے حیرت اور پریشانی سے کہا۔ وکیل صاحب اس سے بھی زیادہ متحیر ہو گئے۔

''کیا مطلب؟ انہوں نے آپ کو نہیں بتایا کہ انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور

ڈاکٹر کے شدید اصرار کے باوجود وہ ہسپتال شفٹ نہیں ہوئے۔ خود کو ٹھیک ظاہر کرتے رہے۔ میں جب انہیں ملنے آیا تو وہ ٹھیک نہیں تھے۔ حیرت ہے آپ گھر میں تھیں ور...''

''چھوڑیں وکیل صاحب! مجھے ملازمہ نے بتایا تھا کہ معمولی سی طبیعت خراب ہے۔ کمرے میں وہ کسی کو آنے نہیں دیتے تھے۔'' اس نے الجھ کر کہا۔ تب وکیل صاحب نے گھور کر عینک کے شیشوں سے اسے دیکھا۔

''اوکے دراصل مجھے انہوں نے یہ خط دیا تھا اور کہا تھا کہ بیگم صاحبہ پڑھ نہیں سکتیں۔ اس لیے تنہائی میں پڑھ کر سنا دینا اور وصیت بھی لکھوائی تھی جو کہ عمیر اور عامر کے وطن آنے پر ان کی موجودگی میں کھولی جائے گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں لفافہ کھول کر آپ کو خط پڑھ کر سنا دوں۔''

''ہوں لیکن آپ کب آئے اور آپ و ہی خط کیوں دیا۔ میں گھر میں موجود تھی مجھے بھی تو دیا جا سکتا تھا۔'' اسے سخت حیرت اور تشویش ہو رہی تھی۔

''اس سلسلے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے آپ کی موجودگی میں بھی ... سہارا لیا اور جیسا کہ آپ نے خود کہا کہ آپ تو ان کی شدید طبیعت خرابی کے بارے میں بھی نہیں جانتیں۔ انہیں بروقت ہسپتال کی طبی سہولتیں اگر مل جاتیں تو حالات کچھ اور بھی ہو سکتے تھے۔ مگر میرے خیال میں گھر کے حالات ایسے نہ تھے تبھی تو میاں صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ بظاہر ٹھیک نظر آنے کے باوجود وہ خود کو ٹھیک محسوس نہیں کر رہے تھے اس لیے انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ اگر میں زندہ نہ رہوں تو یہ خط بیگم صاحبہ کو پڑھ کر سنا دینا۔'' وکیل صاحب نے کچھ جھجکتے ہوئے اور ٹٹولتے ہوئے انداز میں تفصیل بیان کی

''وکیل صاحب! آپ لفافہ کھولیں۔''

''لفافہ تنہائی میں کھولنے کی ہدایت ہے۔'' وکیل صاحب نے منشی جی کی موجودگی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

''منشی جی! آپ باہر جائیں اور اماں نذیراں کو بھیج دیں۔''

''اماں نذیراں کو آپ شامل کرنا چاہتی ہیں۔'' وکیل صاحب نے منشی جی کے جانے کے بعد پوچھا۔

''جی وہ گھر کے فرد کی طرح ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ان سے کچھ پوشیدہ نہیں

ہے۔'' اس نے وکیل صاحب کی تسلی کرائی۔ کچھ دیر بعد اماں نذیراں اندر آ گئیں۔ بتول نے انہیں اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا۔

''جی وکیل صاحب! آپ خط کھول کر پڑھیں۔''

''جی بہتر۔''

''کون سا خط؟ کس کا خط؟'' اماں نذیراں نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اماں جی! میاں صاحب کا خط جو انہوں نے اپنی بیگم بتول صاحبہ کے لیے خود تحریر کیا ہے۔'' وکیل صاحب نے تیزی سے بتایا۔

''انہیں خط و کتابت کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔ بیوی کو خود نہیں کہہ سکتے تھے کیا؟ جو آخری چار روز تک کمرہ بند کیا تو مرنے پر ہی کھلا.....'' اماں نذیراں نے طنزیہ لہجے میں خاص تیزی اختیار کی۔

''جی! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ممکن ہے اس خط میں وہ وجہ بھی موجود ہو۔ بہرحال آپ خط سن لیں۔ مجھے جلدی ہے۔'' وکیل صاحب اکتا سے گئے تھے۔

''اماں نذیراں اب خاموشی سے سنو۔'' بتول نے اماں نذیراں سے کہا۔ وکیل صاحب نے سفید لمبا سا لفافہ ایک طرف سے چاک کیا اور اس میں سے تہہ کیا ہوا خط نکال کر کھولا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔

''اچھی سی بتول!

تسلی عرض!

نہیں معلوم کہ تمہیں کس طرح اور کس نام سے مخاطب کروں۔ ندامت اور پشیمانی سے میرا سر جھکا ہوا ہے اور ہمت جواب دے گئی ہے۔ بار بار تمہارے کمرے کے پاس جا کر لوٹ آیا۔ تمہیں مخاطب کیے بنا۔ اب جب کہ مجھے یہ یقین ہو چلا ہے کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے تو میں نے کاغذ اور قلم کا سہارا لیا ہے۔ شاید یہ خط میرے مرنے کے بعد تمہیں ملے گا۔ تم نہ جانے سن کر کیا کرو گی۔ نفرت سے منہ موڑ لو گی یا صبر سے ہونٹ سی لو گی۔ مگر بتول! مجھے معاف ضرور کر دینا۔ میں اور صادقہ بیگم تمہارے مجرم ہیں۔ ہمارے غلط فیصلے نے تمہاری خوبصورت زندگی کو بدنما کر دیا۔ صادقہ بیگم نے صرف اپنی انا کی تسکین اور ... میں اپنی ... کھنے کے لیے تمہیں بتول یا۔ وہ تمہیں ... سے ... خط ... اہم رکھتی تھیں ... عمیر ...

میں سے کسی کی بھی امانت سمجھ کر رکھ لیتیں مگر نہ جانے کیوں اپنے ہی مقابل لا کر تمہیں اور مجھے ہی آزمایا ؟

یہ جانتے ہوئے بھی کہ انیس سالوں سے میں وفاداری کا ثبوت دے رہا ہوں میری آزمائش کیوں مقصود ہوئی؟ میں نے خود کیوں انکار نہیں کیا......؟ یقیناً میں ہمیشہ سے صادقہ کو اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت دیتا چلا آیا تھا۔ اس موقع پر بھی میں نے اس کے سامنے گردن جھکا لی۔ صادقہ لوگوں کے دل جیتنے کے لیے مجھے اور تمہیں آزمانے کے لیے یہ بازی کھیل گئی۔ کوئی عورت ایسا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مگر اس نے کیا۔ کیوں کہ اسے مجھ پر یقین تھا۔ اسی لیے تو جو تکون اس نے کھینچی تھی اس میں خود مختار نقطہ تو وہی تھی۔ میں تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ وہ چھلانگ مار کر تمہاری جگہ بیٹھ گئیں اور تمہیں اپنی جگہ لا بٹھایا۔ اس کے اندر تمہاری عمر کی نوجوان لڑکی بیدار ہوگئی۔ شوخ وشنگ ناز وادا والی الہڑ۔ تم صادقہ کے قالب میں ڈھل گئیں۔ میں صادقہ کے روپ میں الہڑ بیوی کی اداؤں میں کھو گیا۔ تمہیں نہ میں نے یاد کیا اور نہ صادقہ نے شوہر ہونے کے باوجود میں تمہارا شرعی اور قانونی حق نہ دے سکا۔

صادقہ کے بعد بار ہا یہ فیصلہ کیا کہ تم سے تمہاری مرضی پوچھ کر آزاد کر دوں۔ تمہاری عمر بھی جوگ لینے کی نہیں لیکن میرے اندر کے کمزور اور بیوی سے عہد نبھانے والے شخص میں یہ جرات بھی نہ ہوئی۔ میں کسی صورت صادقہ کو خفا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں۔

اور بتول بیگم! میں آج تمہیں اس رشتے سے پکارتا ہوں جو اللہ اور نبیؐ کی گواہی میں ہمارے درمیان قائم ہوا۔ تم میری بیوی ہو میری ہر شے کی حصے دار۔ بس ہو سکے تو میری کوتاہی، میری غلطی اور میری خطا معاف کر دینا۔ صادقہ کو بھی ایک نا سمجھ عورت سمجھ کر دل سے معاف کر دینا۔ یقیناً اس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ جس کی وہ معافی بھی نہ مانگ سکی۔ اور میں جو کہ درست فیصلہ نہ کر سکا۔ بہت بڑا خطا کار ہوں۔ دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔ کاش! میں تم سے روبرو بات کرنے کی جرأت کر سکتا۔ تمہیں پکار سکتا۔ معافی مانگ سکتا۔ طبیعت کی خرابی ہی میں میں نے اپنے ذہن کا بوجھ یہ خط لکھ کر [illegible]نے کی کوشش کی ہے۔ وصیت نامہ بھی لکھوا دیا ہے۔ تمہیں شرعی اور قانونی حق کے تحت منقولہ غیر منقولہ جائیداد اور بینک بیلنس میں سے حصہ ملے گا۔ اگر چاہو تو کوئی نیا گھر بنا لینا ورنہ اس گھر کی اصل مالکن بن

کر ہمیشہ رہنا۔ نہ جانے صحت بحال ہوتی ہے یا نہیں۔ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں۔ تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔ زندگی میں جو تلافی کرنی چاہئے تھی وہ نہ کر سکا۔ میں یقیناً تمہارا مجرم ہوں لیکن مجھے پوری امید ہے کہ تم تمام عرصے کی کوتاہیاں اور زیادتیاں فراخدلی سے معاف کر دو گی۔

فقط گنہگار

میاں محمد حسین

''خلاف توقع ہے یہ سب......؟''

''شش کچھ نہ بولیں۔ کچھ نہ کہیں۔'' وکیل صاحب کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بتول نے انہیں چپ کر دیا۔ اماں نذیراں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اشکوں کا سیلاب اتنا طوفانی اور ہنگامہ خیز تھا کہ اس کے شور اور زور میں نہ کچھ سنائی دیا' نہ دکھائی دیا۔ وکیل صاحب نے لفافہ بتول کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اسے حاصل زندگی سمجھ کر بھیگی پلکوں سے لگا لیا۔



بانکی

میں بھی سوچوں گا، تو بھی کر معلوم
اک خلا کیوں ہے اپنی بستی میں

میں جب بھی کسی کام سے گھر گیا تو اسے اپنی بیوی سکینہ کے پاس ہنستے مسکراتے، کھل کھلاتے دیکھا۔ مہندی رچے ہاتھ، کاجل سے سجی آنکھیں، سرخی مائل ہونٹوں پر کسی نہ کسی رنگ کی لپ اسٹک لگائے میں سوکھی سڑی زردی مائل رنگ والی سکینہ کے قریب اسے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔ دونوں میں کتنا فرق ہے؟ میرے ذہن سے سوال کلبلاتا ہوا باہر نکلتا اور خون کی گردش کے ساتھ میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ میں اچانک سکینہ کی نظر خود پر پڑنے سے چونکتا اور سر کھجا کر اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ مگر کمرے کی کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ سرکا کر میں جھری میں سے بھی اس مکمل دوشیزہ کو نامکمل دیکھتا رہتا۔

میں مجرم بنتا جا رہا تھا اپنی سکینہ کا۔ وہ میرے دو کمروں کے چھوٹے سے گھر کی ملکہ بن کر حکومت کرتی تھی۔ میری آٹو ورکشاپ تک اس کی حکمرانی تھی۔ میرے سب شاگرد اسے استانی جی پکارتے تو وہ جھوم اٹھتی۔ مجھے اس سے شدید محبت تھی۔ اس کا اظہار میں بارہا اس سے کر چکا تھا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کر کے اس بات کا یقین دلاتا کہ وہی میرے جسم و جاں کی مالک ہے۔ یہ سچ بھی تو تھا کہ اس کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ دو سال ہو گئے تھے شادی کو مگر اب تک سکینہ کی گود خالی تھی۔ وہ اداس ہو کر میرے سینے پر سر رکھ کر اس کمی کا اظہار کرتی تو میں پیار بھری تسلی دے کر اس کی اداسی کم کر دیتا۔ وہ جانتی تھی کہ میری محبت پاک صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کوئی میل اور آلودگی نہیں۔

مگر جب سے وہ ہماری ہمسائی بن کر آئی تھی تب سے میں اپنے اندر کے چور سے جنگ لڑ رہا تھا۔ اپنی محبت کے آئینے سے چوری چوری گرد صاف کر رہا تھا۔ وہ بقول سکینہ کے اپنی بوڑھی نانی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس سے آگے نہ ہی سکینہ نے کچھ بتایا اور نہ ہی اس بارے میں کچھ پوچھ کر میں بیوی کی نظر میں مشکوک بننا چاہتا تھا۔

پہلے پہل تو میں ورکشاپ سے ایک آدھ بار آتا تھا لیکن جب سے بانکی ہماری ہمسائی بن کر آئی تھی تب سے میں جیسے بہانے کر کے دو تین مرتبہ گھر کے چکر لگانے لگا۔ خاص کر دوپہر کے بعد جب وہ صحن میں پڑے تخت پر سکینہ کے برابر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوتی۔ میرے اس طرح چوری چوری آنے پر ایک دن سکینہ نے کہہ ہی دیا۔

''کیوں جی! یہ آج کل گھر کے چکر ہی لگاتے رہتے ہو یا کام پر بھی دھیان ہے؟''

''وہ بس کام زیادہ نہیں ہوتا۔'' میں گھگھیا گیا۔ آخر سکینہ عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مرد کے اندر کی چوری وہ اس سے بھی پہلے پکڑ لیتی ہے۔ سکینہ نے شاید سادگی سے پوچھا تھا مگر میں محتاط ہو گیا۔ میں نے ذرا پہلے کی طرح آنا شروع کر دیا مگر اس کا سکینہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور میں جو چاہتا تھا کہ بانکی ضرور مسکرا کر کم آنے کا گلہ کرے گی تو اس نے بھی خلاف توقع لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔ میں شرمندہ ہوا مگر یہ شرمندگی بڑی عارضی تھی۔

اس روز جب میں ورکشاپ کیلئے نکلا تو بانکی لال ململ کے کرتے پر دھانی آنچل اوڑھے، عنابی ہونٹوں پر مسکان سجائے اپنی لمبی سی چوٹی لہراتی مجھ سے ٹکرا گئی۔ مجھے جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ پہلی بار ہنس کر بولی۔

''معافی دینا بھائیا!'' وہ تو یہ کہہ کر میرے گھر میں داخل ہو گئی مگر میں جیسے وہیں پتھر کا ہو گیا۔ بالکل ایسے جیسے کسی پری نے چھو کر ساکت کر دیا ہو۔ میرے بدن سے روح نکل کر اس کے بدن سے لپٹ کر میرے ہی گھر میں داخل ہو گئی۔ میں سحر زدہ سا اپنی روح واپس لینے کیلئے پلٹ کر گھر میں آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر ہنسی اور بولی۔

''سکینہ! ابھی میری بھائیا سے زوردار ٹکر ہو گئی تھی۔''

میں حواس باختہ سا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو سکینہ کا بہت گہرا جملہ میرے پیروں کی زنجیر بن گیا۔

''یہ سویرے سویرے کام دھندا چھوڑ کر گھر میں کیوں گھس آئے ہو؟''

''من نہیں چاہ رہا۔'' میں نے دھیرے سے کہا تو وہ کمر پر ایک ہاتھ رکھ کر ابرو چڑھا کر میرے روبرو آ گئی۔

''دیکھو! اپنا من میرے تک اور ورکشاپ تک لگاؤ۔''

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' اندر سے کانپ کر مگر اوپر سے ڈٹ کر میں نے پوچھا۔

''مطلب وہی ہے نواب علی! جو تیرے اندر کے مرد نے سمجھ لیا ہے اور سن مرد نہ بن' میرا گھر والا ہی رہ۔'' اس نے اس زور سے میری دیوانگی کو للکارا کہ پہلی مرتبہ میں نے شدید غصے بھری نگاہ اس پر ڈالی اور تن تنا کر باہر نکل آیا۔ دور تک میں نے بانکی اور سکینہ کا قہقہہ سنا۔ میرے اندر جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

سارا دن کوئی کام نہیں کر سکا۔ سب شاگرد حیران تھے۔ پوچھا کسی نے بھی نہیں۔ چپ چاپ کام میں لگے رہے۔

شام کو سکینہ سب کچھ بھول بھال کر میری خدمت میں لگی رہی۔ اس نے میری پسند کا کھانا پکایا تھا۔ میں نے اپنے خیالات میں کھوئے کھوئے کھانا کھا لیا اور اس سے چائے کا کپ لے کر چائے بھی پی لی۔ وہ میری پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ میں نے ترچھی آنکھ سے دیکھا اور پھر کروٹ لے لی۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی پھر دوسری طرف میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اپنے خشک پتلے پتلے ہاتھوں سے میرا سر دبانے لگی۔

''تو جا آرام کر میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ٹالنے کو کہا۔

''اوں ہوں! مجھے تو صرف تیرے پاس آرام ملتا ہے۔''

''بھئی کیا مصیبت ہے؟''

''یہ تو پیار ہے نواب علی! تیرا میرا پیار۔'' اس نے میرے قریب ہو کر کان میں سرگوشی کی۔ مجھے ذرا اچھی نہیں لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کے جملے میں کہتا تھا اور وہ شرما کر سر جھکا لیتی تھی۔

''کوئی اور بھی بات ہے تیرے پاس۔'' میں نے بے زاری سے پوچھا۔

''بس اور بات تو وہی ہے کہ اللہ کب ہمارے آنگن میں پھول کھلائے گا۔''

''تیری کوکھ ہی بانجھ ہے تو......'' میں نے بڑی بے رحمی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چیخیں مارنے لگی۔

''یہ یہ تو کہہ رہا ہے نواب علی! میرا دوش ہے۔ میں بانجھ ہوں۔ نہیں میں بانجھ نہیں ہوں۔ تو غلط کہتا ہے۔'' وہ دیوانوں کی طرح ہچکیاں لینے لگی۔ میرے اندر لمحے بھر کو رحم آیا اور میں نے اسے بازوؤں میں چھپا لیا۔ کمزور لمحوں کی گرفت میں کچھ دیر کو میں سکینہ میں گم ہو کر بانکی کو بھول گیا۔

صبح میں گہری نیند میں تھا کہ کسی نے دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا۔ کچھ دیر میں نے انتظار کیا کہ شاید سکینہ کھول دے مگر تنگ آ کر میں مندی مندی آنکھوں سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی موتیے کی مہک میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑے دوسرے ہاتھ سے اپنی چوٹی ہلاتی وہ مجھ سے ٹکراتی اندر گھسی چلی آئی۔ میرا روم روم جیسے بیدار ہو گیا۔ نیند اور جھنجھلاہٹ کہیں دور بھاگ گئی۔ وہ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر سکینہ کو پکارنے لگی۔ سکینہ کو نہ پا کر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''بھائیا! سکینہ کہاں ہے؟'' اس وقت مجھے وہ کچھ بری لگی۔ اس کا بھائیا کہنا مجھے برا لگا۔ میں تو کچھ اور سننا چاہتا تھا۔

''نہا رہی ہے شاید......'' غسل خانے سے گرتے ہوئے پانی کی آواز پر میں نے بتایا۔

''اچھا میں پھر چلتی ہوں نانی کو ناشتہ دینا ہے۔'' وہ پلیٹ تخت پر رکھ کر میرے قریب سے گزرتے ہوئے بولی۔ اس کی بل کھاتی چوٹی میرے ہاتھ سے چھو گئی۔ میرا دل چاہا کہ چوٹی کھینچ کر اسے خود پر گرا لوں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اپنے گھر۔'' اسے میرا سوال غیر متوقع لگا۔ میں نظریں چرا گیا۔

''یہ بھی تو تمہارا گھر ہے۔''

''نہ جی' یہ تو سکینہ کا گھر ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی دروازے میں پہنچ گئی۔

''یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔''

''نہ بھائیا! میں کسی چیز کو اپنا نہیں کہتی۔'' وہ یہ کہہ کر گویا میرے کلیجے پر گھونسا مار گئی۔ میں دل مسلتا واپس صحن میں آ گیا۔ اسی لمحے غسل خانے سے سکینہ باہر نکلی۔ اسے دیکھ کر میری پیشانی پر ہزار سلوٹیں پڑ گئیں۔ میں منہ موڑ کر کمرے میں آ گیا۔ اس نے کیا سمجھا؟

کیا جاتا؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس مجھے بانکی کا یوں جانا اچھا نہیں لگا۔ میرا دل چاہا کہ سکینہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں اور اس کا ہاتھ تھام کر گھر میں لے آؤں مگر صرف اس وقت یہ سوچ کر رہ گیا۔

بانکی میرے اعصاب پر چھا گئی تھی۔ اس کا گھر والا جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہتا۔ میں رات دن اس ادھیڑ بن میں تھا کہ بانکی کے بنا جینا محال ہے اور اس کا ملنا بھی آسان نہیں۔ کیا کیا جائے؟ اس سوچ بچار میں سکینہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سوتے میں، جاگتے میں بانکی میرے پاس آ جاتی اور سکینہ میلوں دور چلی جاتی۔ مجھے سکینہ سے وابستہ ہر شے سے چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کا پکا کھانا بدمزہ لگتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ دھلائی شدہ کپڑوں میں کیڑے نکالنے لگا تھا۔ کوئی چیز جو ذرا جگہ پر نہ ملتی تو قیامت برپا کر دیتا۔ میں یہ دلی طور پر چاہنے لگا تھا کہ کوئی ایسا جھگڑا ہو جو میرے اور سکینہ کے درمیان آخری جھگڑا ثابت ہو۔

ورکشاپ میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ من گھائل اور روح بے کل رہتی۔ بار بار گھر پہنچ جاتا۔ اس وقت بھی میرا دل گھر کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام دو انجن دیکھے۔ ان کے پیچ کسے اور اپنے سمجھدار شاگرد گلو کو بل بنا کر دینے اور گھر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سکینہ کے پاس بیٹھی ہوگی۔ اس کی چوڑیاں کھنک رہی ہوں گی۔ ناک کی لونگ چمک رہی ہوگی۔ اس کے خوبصورت بدن پر کوئی پیارا سا رنگ بہار، نکھار رہا ہوگا۔ اسی خیال میں میں نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ آج وہ دونوں صحن میں نہیں تھیں بلکہ کمرے میں تھیں۔ میرے لیے مشکل ہوگئی کیونکہ دونوں کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ اندر نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ دروازہ، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے کمرے میں آ گیا۔ وہ سکینہ کے ہاتھ پر مہندی لگا رہی تھی۔ سیاہ جالی دار قمیض اور دوپٹے میں اس کا سفید رنگ عجب بہار دکھا رہا تھا۔ ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک ہوش چھین لینے کیلئے کافی تھی۔ میں مبہوت سا رہ گیا۔ سکینہ تنک کر اٹھی اور میرے سامنے آ کر بولی۔

''نواب علی! تیرا ورکشاپ میں دھیان نہیں۔''

''وہ ذرا کام سے آیا ہوں۔'' بانکی کے سامنے میں اسے سختی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

''چلو پھر جاؤ کام کرو! یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔''

سکینہ نے میری نظروں کی چوری پکڑتے ہوئے کہا۔ میں غم و غصے کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا اور مسہری پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کیسے نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ کب بانکی گئی اور کب سکینہ نے آ کر مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے کڑوا سا منہ بنا کر سکینہ کو دیکھا۔ اس نے مہندی رچے ہاتھ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! کیسی مہندی رچی ہے؟''

''اوہو، یہ دکھانے کیلئے تو نے مجھے جگا دیا۔''

''کب تک سونا ہے، روٹی نہیں کھانی کیا؟''

''زہر کھانا ہے۔'' میں نے حد درجہ جل کر کہا تو وہ بھنا اٹھی۔

''نواب علی! تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟''

''پاگل ہو گیا ہوں میں، بول کیا حل ہے تیرے پاس؟'' میں نے تڑخ کر پوچھا۔

''دیکھ نواب علی! پاگل ایسے نہ ہو جانا جہاں سے اپنا آپ بھی چھن جائے۔'' سکینہ نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

''او اچھا اچھا، جا اب میرا پیچھا چھوڑ دے۔'' میں نے برے طریقے سے دھتکارا۔

''تیرا پیچھا کیسے چھوڑ دوں۔ میرا ہے ہی کون؟'' سکینہ اداسی سے بولی۔

''کیوں میری قسمت میں خوشی نہیں ہے کیا، میں خوشی کو ترستا مر جاؤں۔'' میں نے موقع ملتے ہی کھری کھری سنا دیں۔ وہ دکھی ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔

''اب جا، جا کر اپنا کام کر۔ مجھے دو پل سکون لینے دے۔'' میں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا تو وہ پھٹ پڑی۔

''ہاں ہاں! میں جانتی ہوں تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں میں کیوں بری لگنے لگی ہوں۔'' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے اٹھا کر دھنک ڈالا۔ پہلی مرتبہ میرا یہ روپ دیکھ کر وہ سسکیاں بھی خوف زدہ ہو کر لیتی رہی۔ میں بے زاری سے چپل پہن کر گھر سے نکل آیا۔ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ میں نے بلاوجہ ہی یہ ذلیل حرکت کی۔ میں نے بانکی کے گھر کے باہر چند لمحے رک کر دیکھا اور پھر ورکشاپ کی طرف آ گیا۔

میرے بدلتے رویے نے سکینہ کو خوفزدہ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ سمجھدار بھی بنا دیا۔ روز روز میری دست درازی اور مار پیٹ سے شاید اس پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ میرے

بدلنے کی وجہ بانکی ہے۔ اس نے ایک تبدیلی پیدا کی۔ وہ صبح جلدی جلدی کام ختم کر کے خود بانکی کی طرف چلی جاتی۔ میں جب دل کے ہاتھوں بے قرار ہو کر گھر آتا۔ صرف بانکی کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے کیونکہ وہ تو میرے لہو میں گردش کرتی تھی۔ دروازے پر لگا تالا میرے دل کو کچل ڈالتا۔ بانکی کے دروازے پر بار بار دستک دینے سے حیا محسوس ہوتی اس لیے چپ چاپ لوٹ آتا۔

آج بھی شاگردوں کی نظروں سے بچ کر آ گیا۔ اب تو شاگرد بھی چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے مگر میں بھی تو مجبور تھا۔ بانکی کو دیکھے پورے پانچ روز ہو گئے تھے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے بانکی کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ سکینہ کو یقین ہو گیا تھا کہ دروازے پر میں ہی ہوں۔ لہٰذا وہ دوپٹہ سر پر ڈالتی ہوئی باہر آ گئی۔ میں نے خونخوار نظروں سے گھورا اور اسے کھینچتا ہوا گھر لے آیا۔ تالا کھول کر میں نے اسے دروازے سے اندر دھکا دیا اور دروازہ بند کرتے ہی ٹھڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔

''تیرا گھر سے بہت پاؤں نکل گیا ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تیری آوارگی برداشت نہیں کر سکتا۔'' میں نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ سکینہ کے منہ سے' ناک سے خون نکلنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگی' منت کرنے لگی۔

''اب تو نے گھر سے باہر قدم نکالا تو ہمیشہ کیلئے نکال دوں گا۔ جسے تجھ سے ملنا ہے وہ یہاں آئے۔'' میں نے دل کی بات کہہ دی۔ بانکی کو بنا دیکھے مجھ پر کیا گزر رہی تھی' یہ میں ہی جانتا تھا۔ میں سکینہ کو روتا چھوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔ سکینہ کی سسکیاں میں بڑی دیر تک سنتا رہا مگر میں کیا کرتا۔ میرے اندر نواب علی کی موت ہو چکی تھی جو سکینہ پر جان لٹانے والا شوہر تھا اس کی جگہ تو بانکی کا عاشق پیدا ہو چکا تھا۔ مدہوش اور بے خود، جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بانکی کے جذبات کیا ہیں؟ بس اس کے ملنے کی ہر سبیل کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تو سکینہ کو مار پیٹ کر، دھمکی دے کر گھر میں رکھنا تھا تاکہ بانکی پہلے کی طرح آئے، ہنسے، قہقہے لگائے۔ اس کے بانکپن کے جلوے میں دیکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ اب سکینہ کبھی باہر نہیں جائے گی۔ اس یقین پر میں بہت خوش تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ میں صبح دانستہ دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔ سکینہ تو خفا تھی جگانے نہیں آئی۔ میں جانتا تھا کہ اپنی نانی کو ناشتہ دے کر کام کاج سے فارغ ہو کر وہ ضرور آئے گی۔ میرا

یقین بالکل درست تھا۔ وہ بالکل اسی طرح اپنی ترنگ میں ہنستی مسکراتی آ کر سکینہ سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ میں نے دھیرے سے اٹھ کر ذرا سا کھڑکی کا پردہ سرکایا اور دیکھنے لگا۔ آج تو وہ اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس نے پیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بالوں کی چٹیاں سینے پر ڈال رکھی تھیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر جب وہ بات کرتی تو ریشمی چوڑیوں کی کھنک سے میرے اندر گدگدی ہونے لگی۔ کچھ دیر میں اسی طرح یہ غیر اخلاقی حرکت کرتا رہا۔ پھر گلا صاف کرتا ہوا صحن میں آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی۔

''بھائیا! مجھے بتا ہی دیتے کہ سکینہ کی طبیعت خراب ہے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہے یہ ایک ہی دن میں۔''

''یہ تو خود بیمار ہیں۔'' سکینہ نے طنز کیا' وہ نہیں سمجھی۔

''اچھا! اسی لیے گھر میں ہیں۔''

''نہیں' میں جا رہا ہوں۔'' میں نظریں چرا کر باہر نکل آیا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا' یہی کافی تھا۔ مجھے کافی حد تک سکون آ گیا تھا۔

یہ بات سکینہ نے رات کے کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے مجھے جتلا دی۔

''لگتا ہے آج تیری طبیعت ٹھیک ہے۔'' میں نے چونک کر دیکھا۔

''میں نے تجھے کب کہا میری طبیعت خراب ہے۔''

''بس میں نے محسوس کیا ہے۔ کیونکہ نہ سالن کی پلیٹ پھینکی اور نہ مجھے مارا پیٹا۔'' سکینہ کے لہجے میں زہر کی گھلاوٹ تھی۔

''پھر تو شکر ادا کر۔'' میں نے بھی طنز کیا۔

''اور تم فکر کرو ہمارا چھوٹا سا یہ گھر کہیں طوفان میں نہ گھر جائے۔'' اس نے بہت گہری بات کر دی۔ میں طنزیہ ہنس کر بولا۔

''ہنہ! یہ گھر ہے یا ویرانہ۔ ایک بچہ تو رونق لا نہ سکا تم اسے گھر کہتی ہو۔''

نواب علی! یہ بچے کی آڑ میں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

''جا' جا کر کام کر۔ خواہ مخواہ چنگاریاں نہ کریدا کر۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ وہ چلی گئی اور میں بانکی کے خیالوں کھو گیا۔

سکینہ پہلے والی سکینہ نہیں رہی تھی۔ رات دن اپنے خیالوں میں گم رہتی۔ واجبی سی

بات کرتی۔ الگ تھلگ رہتی۔ اس میں سے تو وہ حدت بھی شاید جاتی رہی تھی جو عورتوں کی فطرت ہوتی ہے۔ کوئی شام، رات اس کیلئے اہم نہیں رہی تھی۔ وہ سرِشام ہی چادر تان کر سوتی بن جاتی حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ بے چین اور مضطرب ہے۔ کوئی بھی عورت خطرہ بھانپ لینے کے بعد بے فکری کی نیند نہیں سو سکتی۔ پھر بھلا سکینہ کیسے سو جاتی۔ وہ بہت کچھ جان کر بھی خاموش ہو گئی تھی۔ سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود کچھ بھی کھل کر نہیں کہہ رہی تھی۔ میں جب بھی اس کا سامنا کرتا تو ایک دھڑکا سا لگ جاتا کہ وہ ابھی چیخ چیخ کر کہے گی۔ ''تمہارا بانکی سے کیا رشتہ ہے؟'' یا پھر بانکی کو گھر سے دھکے دے کر نکال دے گی۔ مگر سکینہ نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بس اتنا تھا کہ وہ یہ جان گئی تھی کہ اس کے اور میرے بیچ اب کچھ بھی نہیں رہا۔ تبھی تو وہ بڑے صبر کے ساتھ پہلے بستر سے، پھر کمرے سے الگ ہو گئی۔ مجھے سکینہ کے اس عمل سے دکھ تو نہیں ہوا۔ میں مطمئن تھا۔ مجھے خود پر اختیار ہی کہاں رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا ریموٹ کنٹرول بانکی کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو اسی کی طرف کھنچا چلا جاتا ہوں۔ سکینہ تو مجھے اب دکھائی بھی نہیں دیتی تھی۔ بانکی اس کے پاس بیٹھی ہوتی تو بھی میری نظریں بانکی کے چہرے پر جمی رہتیں۔ ایک مرتبہ تو سکینہ نے گلا صاف کرنے کے بہانے مجھے چونکایا۔

''نواب علی! گوشت اور سبزی جا کر بھیجو تا کہ کھانا پکاؤں۔''

''ہنہ ہاں! میں لاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لاتا نہیں' کسی کے ہاتھ بھیج دینا۔'' سکینہ نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔ میں سلگ اٹھا مگر بانکی کی موجودگی میں کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ سکینہ کے پاس بیٹھی اپنی کلائی میں پڑی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ میں چوری سے دیکھتا ہوا باہر آ گیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو شرمندگی ہوئی۔ سکینہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ شاید مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

اس طرح کی آنکھ مچولی میں دو ماہ گزر گئے۔ میں کچھ دیر کیلئے ورکشاپ جاتا اور پھر گھر چلا آتا۔ بانکی کو دیکھ کر ٹھنڈک سی دل میں اتار کر لوٹ آتا۔ سکینہ صرف طنزیہ گھور کر رہ جاتی مگر مجھے کون سی پروا تھی۔ پھر سکینہ کی اہمیت ہی کیا رہ گئی تھی۔ وہ اگر کچھ کہتی تو میرے پاس چپ کرانے کے ہزار طریقے تھے۔ مار پیٹ کر، تشدد کر کے میں اس کی زبان بند کرا دیتا۔ اس لیے وہ صرف گھور کر رہ جاتی۔ میں دلی طور پر خوش تھا۔ میری خوشی اس دن فکر میں بدل گئی جس دن بانکی لمحہ بھر کو نہیں آئی۔ میں نے سارا دن گھر میں رہ کر بے قراری سے گزارا مگر وہ نہیں

آئی۔ سکینہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی اور کام میں مگن ہو گئی۔ رات ہو گئی، میرا دل تڑپ رہا تھا اور اکسا رہا تھا کہ جاؤں دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھوں کہ ''آج تم کیوں نہیں آئیں؟'' مگر یہ کرنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔ میں کس رشتے سے اس سے یہ جا کر پوچھتا۔ اس لیے ساری رات انگاروں پر لیٹتے گزار دی۔

رات بھر جگانے سے صبح پورا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو کچھ سکون ملا۔ میں نے سکینہ کو چائے لانے کو کہا اور خود پھر کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد سکینہ چائے لے آئی۔

''کیا آج ورکشاپ نہیں جانا؟'' اس نے پوچھ لیا۔

''تجھے اس سے کیا مطلب ہے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔'' میں نے جل کر کہا۔

''تیری مرضی۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ میں نے گرم گرم چائے پی اور پھر ہاتھوں کا سرہانہ بنا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر بانکی نہیں آئی۔ میرے دل کی بہت بری حالت تھی۔ کبھی لیٹ کر، کبھی ٹہل کر، کبھی بیٹھ کر میں انتظار کر رہا تھا۔ سکینہ لاپروائی سے اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا پوچھا میں نے انکار کر دیا۔ اس نے چائے پوچھی تو میں نے چلا کر کہا۔

''مجھے تیری مہربانیاں نہیں چاہئیں۔''

میں کیا کرتا۔ بانکی کہاں گم تھی؟ کیوں نہیں آ رہی تھی؟ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا۔ میری یہ پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ دوسرا دن بھی شب میں بدل گیا اور پھر تیسرا، چوتھا دن بھی اس کی راہ دیکھتے گزر گیا۔ میرا بہت برا حال تھا۔ حلق سے پانی تک نہیں اتر رہا تھا۔ شیو بڑھ گئی۔ مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ورکشاپ سے شاگرد بار بار پوچھنے آئے۔ سکینہ نے جب بھی آ کر اطلاع دی میں برس پڑا۔

''تو اندھی ہے' میرے حالت نہیں دیکھتی۔'' وہ یہ سن کر چلی جاتی اور کوئی بہانہ بنا کر بھیج دیتی مگر جب گلو ہو کر گیا تو سکینہ جرأت کر کے میرے سامنے آ گئی۔

''یہ کیا کر رہے ہو نواب علی؟''

''کیا مطلب ہے؟'' میں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"یہ جوگ کیوں لے لیا ہے، سارا کام برباد ہو جائے گا۔"

"تجھے اس سے کیا مطلب ہے؟ مجھ سے زیادہ فکر ہے تجھے کام کی۔" میں تو اٹھ بیٹھا۔ وہ کچھ سہمی۔

"آج پانچواں دن ہے؟ آخر ورکشاپ کیوں نہیں جاتے؟"

"تجھے میں نے بیس مرتبہ کہا ہے کہ مجھ سے اس طرح کا سوال نہ کیا کر۔"

"کیوں؟ کیوں نہ کیا کروں، آخر میں تمہاری بیوی ہوں۔" اس نے حق جتلایا تو میں آگ بگولا ہو گیا۔

"یہ سب تیرے ہی تو کرتوت ہیں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ تو نے میری خوشی برباد کی ہے۔ میں تجھے ہی نکالتا ہوں۔ بہت گھمنڈ ہے نا تجھے میری بیوی ہونے پر۔ میں یہ سلسلہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔" میں اسے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا صحن میں لے آیا۔

"نواب علی! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ رونے لگی۔ ہاتھ جوڑنے لگی مگر میں نے ایک نہ سنی۔ میرے اندر کا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ ضرور سکینہ نے بانکی کو آنے سے منع کیا ہے۔ یہ غبار تو نکلنا ہی تھا۔ میں نے کاغذ قلم اٹھا کر سکینہ کی تقدیر ہی برباد کر دی۔ میں نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ اسے کاغذ کا ٹکڑا تھما کر خود سے ہمیشہ کیلئے دور کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو بہاتی رہی۔ میں فرعون بنا اپنے کمرے میں بیٹھا اس کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے کوئی پشیمانی نہیں تھی اور نہ دکھ۔ میرا دل جیسے مطمئن ہو گیا تھا کہ اب بانکی میری ہو سکتی ہے۔ یہی خیال یقین میں بدل گیا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر میں نے باہر نکل کر دیکھا، سکینہ جا چکی تھی۔ میں خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے سارے گھر کی بتیاں جلا کر اپنی خوشی کو بڑھایا۔ سکینہ کے ہاتھ کا کھانا مزے لے کر کھایا اور صحن میں ہی لیٹ گیا۔ اب مجھے صبح کا انتظار تھا۔ ایک نئی اور سنہری صبح کا۔ میں بانکی کے سنگ رہنے کے منصوبے بناتے بناتے سو گیا۔ میرے اندر نہ کوئی دکھ تھا اور نہ کہرام۔ سکینہ کو دور کر کے میں پرسکون نیند سو گیا۔

میری زندگی کی نئی صبح طلوع ہوئی۔ مجھے ہر چیز اجلی اجلی، نکھری نکھری سی دکھائی دے رہی تھی۔ صرف میرے برابر کا پلنگ اداس تھا۔ جس پر سکینہ سوتی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیوار سے لگا دیا اور خود نہانے کی غرض سے غسل خانے میں گھس گیا۔ تازہ دم ہو کر میں نے

اپنے لیے چائے بنائی اور چسکی لے کر چائے کا مزہ لیا۔ میں مسلسل دروازہ دیکھ رہا تھا کہ ابھی چوڑیاں کھنکاتی وہ اندر آ جائے گی۔ اور "بھائیا" کہنے لگے گی تو میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منع کر دوں گا اور اس کا ہاتھ چوم لوں گا۔ مگر میرا خیال خیال رہا۔ وہ نہیں آئی۔ میں نے شیو کی، کپڑے بدلے اور خود اس کے پاس جانے کی جرأت کی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دوران خون میں تیزی آ گئی تھی۔ میں نے اس کے دروازے کے باہر رک کر مزید ہمت جمع کی۔ گلی میں دیکھا۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑے اعتماد کیساتھ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔ میرا دل مچل اٹھا۔ درازے کے پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"جو بھی ہے، تھوڑی دیر بعد آئے۔ اس وقت میں گھر میں اکیلی ہوں۔" میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں مردہ قدموں سے واپس آ گیا۔

انتظار کے یہ لمحے بہت تڑپانے والے تھے۔ وقت سرک رہا تھا، اس کی راہ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ اسی دوران گلو آ گیا اور میری طبیعت ناسازی کا جواب سن کر چلا گیا۔ مجھے اپنی حالت پر خود بھی حیرت تھی کہ میں اس کیلئے اس قدر بے چین ہوں جبکہ آج تک اس کی طرف سے تو ایک اشارہ بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے تو دل و جان سے اسے اپنا سمجھ لیا تھا۔ وہ صرف میری ہے۔ میرے اس سونے گھر کی مالک۔ اس کے آنے سے بہار آ جائیگی۔ میرے سوکھے آنگن پر بادل بن کر برسے گی۔ اس گھر کا کونا کونا اس کی چوڑیوں کی کھنک سے جی اٹھے گا۔ اس کے مہندی رچے ہاتھ میرے ویران گھر کو سجائیں گے۔ وہ میرے بے قرار دل کو قرار دے گی۔

میرے اردگرد خوبصورت سوچوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ بہت سا وقت گزر گیا۔ میں نے پھر ہمت کی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تولیے سے منہ صاف کیا۔ بالوں میں کنگھی کی اور پھر باہر آ گیا۔ اس کے گھر کے باہر قدم جمائے اور پھر دستک دی۔ تیسری دستک پر ویسا ہی چوڑیوں کا شور ہوا جیسا کچھ دیر پہلے سنا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا

"میں، میں ہوں نواب علی!" میں نے دھڑکتے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''اچھا' اچھا!'' اس نے ہنس کر دروازہ کھول دیا۔

''وہ میں' میں تجھے لینے آیا ہوں۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

''میں ابھی آنے والی تھی۔''

میں خوش ہو گیا۔

''چل' آ میرے ساتھ۔'' میں نے کہا تو وہ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''بھائیا! آپ سکینہ کو کہیں میں ابھی آتی ہوں۔''

''وہ تو چلی گئی ہے۔''

''ہیں!'' وہ ہنسی۔

''کہاں؟''

''اپنے گھر۔'' میں نے کہا۔

''اپنے گھر؟ کون سے اپنے گھر؟'' وہ تعجب سے ہنسی۔

''بس کہیں چلی گئی ہے' تو چل وہ تیرا گھر ہے۔''

''میرا گھر بھی ہے۔ لیکن سکینہ کی تو طبیعت خراب تھی۔ پھر وہ ایسے میں کیوں چلی گئی؟'' وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''وہ کہہ گئی تھی کہ اپنے گھر جا رہی ہے۔''

''اچھا' میں تو اداس ہو گئی ہوں۔ پورے ہفتے سے سامان باندھنے میں مصروف رہی، اسے مل بھی نہ سکی۔'' وہ افسردہ ہو کر بولی۔

''سامان؟'' لفظ لبوں کے اندر ہی دم توڑ گئے۔

''ہاں! بھائیا ہم جا رہے ہیں۔ میرا گھر والا دبئی سے لاہور آ گیا ہے۔ اس نے خط بھیجا ہے کہ میرے لیے گھر خرید لیا ہے، فوراً آ جاؤ۔ میں ساس سے لڑ کر آ گئی تھی۔ اب الگ گھر لیا ہے تو جا رہی ہوں۔ میں آپ دونوں کو خط میں پتا لکھوں گی، پھر آپ آنا۔'' وہ خوشی خوشی اپنی ترنگ میں بتاتی چلی گئی اور میں جیسے زمین میں گڑ گیا۔

''تیرا گھر والا۔''

''ہاں! مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ بس مزدوری کی خاطر دور چلا گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے تو اپنے گھر جا رہی ہے۔'' میں نے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

''ہاں! سکینہ کو میرا سلام دینا اور بھائیا، اسے جلد لے آنا۔ ایسے دنوں میں خاوند کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے گھر کی تو پہلی خوشی ہے۔'' وہ بولی، میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''پہلی خوشی؟''

''دائی زبیدہ کہہ رہی تھی کہ سکینہ میں خون کی بہت کمی ہے۔ ہم اکٹھے ہی تو گئے تھے۔ آپ اس کی خوراک کا خیال رکھنا۔'' اس نے سادگی سے انکشاف کیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میرے ہونٹ سل گئے۔ نظریں پتھرا گئیں۔ وہ میری کیفیت جانے بنا بولی۔

''آپ ایک منٹ رکیں، میں نے سکینہ کیلئے تحفہ خریدا ہے اسے دے دینا۔'' وہ اندر گئی اور پھر سنہری کاغذ میں لپٹی چوڑیاں میری طرف بڑھا دیں۔

''اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔'' میں نے شکستہ لہجے میں کہہ کر واپسی کیلئے قدم اٹھائے۔

''بھائیا! یہ میری طرف سے سکینہ کیلئے تحفہ ہے۔'' وہ پیچھے سے بولی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے مہندی رچے ہاتھوں میں سکینہ کیلئے چوڑیوں کا تحفہ تھا۔

''بھائیا! بھائیا! بھائیا!'' بانگی کی پرخلوص صدا آتی رہی اور میں لڑکھڑاتے قدموں کو کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

◇......◇......◇

آسیب

حسب معمول اس نے گیلے بالوں کو پشت پر کھلا چھوڑا تو کاسنی لون کی قمیص سیراب ہوگئی۔ اس نے دائیں ہاتھ کی چٹکی سے اسے گستاخ ہونے سے روکا اور مسکرا کر موتیے' گلاب سے گندھے گجرے بالوں میں سجائے اور اٹھلا کر کمرے سے باہر نکلی تو توے پر روٹی ڈالتی بے جی کی پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

انہوں نے چمٹا زور سے فرش پر پٹخا اور کڑوا سا منہ بنا کر اچھو یعنی اپنے اکلوتے بیٹے اسلم کو گھور کے دیکھا۔ وہ تو چھوٹا سا ریڈیو کان سے لگائے گانے سننے میں مگن تھا۔ انہوں نے اس کے لئے پلیٹ میں سالن ڈالا اور توے سے روٹی اتار کر چنگیر میں رکھتے ہوئے دبے دبے لہجے میں سمجھایا۔

''ہر روز ایک ہی بات سمجھاتی ہوں کہ اس طرح رات کے وقت گجرے پہن کر چھت پہ جانا ٹھیک نہیں۔ مگر......''

''او ! اگر مگر چھوڑو بے جی! یہ سب پرانی باتیں ہیں۔'' اچھو نے ریڈیو ایک طرف رکھ کے ہنستے ہوئے بے جی کی بات اچک لی اور کھانا کھانے لگا۔ رابعہ شوہر کی شہہ پر گردن جھٹک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو پھر بے جی قدرے اور اونچی آواز میں بولیں۔

''نئی نویلی دلہن کی کچی مہک ہوتی ہے۔ کھلے بالوں میں پھولوں کی خوشبو شامل ہو جائے تو آسیب کا خطرہ ہوتا ہے۔'' رابعہ نے برا سا منہ بنا کر دوپٹے کا پلو جھٹکا اور بے جی کی بات کی نفی کر دی۔

''بے جی! کس زمانے کی بات کرتی ہو۔ اب آسیب کہاں؟'' اچھو نے نوالہ حلق

سے اتارتے ہوئے کہا۔ رابعہ کی ہمت بندھی وہ جھٹ سیڑھیاں طے کر گئی۔

''تو نئے زمانے کے چکر میں بہت پچھتائے گا۔'' بے جی نے غصے سے کہا۔

''بے جی! وہم نہ کیا کرو۔''

''تو اس شوق سے باز نہیں آئے گا۔ روز روز گجرے لانے نہیں چھوڑے گا۔ جس دن کسی سائے میں آ گئی مشکل ہو جائے گی۔''

چھت کی دیوار سے صحن میں جھانکتی رابعہ نے ساس کو زہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور بڑبڑائی۔ ''ہونہہ! بڑھیا کو اصل تکلیف ان گجروں کی ہے۔ جانے کیا سمجھتی ہے کہ سائیکل میکینک بیٹا ہزاروں روپے کے گجرے لاتا ہے۔''

کچھ دیر بعد جھجکتے ہوئے اچھو نے چھت پر قدم رکھا تو وہ جلدی سے منہ پھلا کر چارپائی پر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ کھلی چھت کے عین درمیان میں ان دونوں کی چارپائیاں بچھی تھیں جن پر دری کے اوپر سفید چمکتی ہوئی چادریں بچھی تھیں۔ پائنتی میں ملتانی کھیس رکھے تھے۔ چھت پر اردگرد کے گھروں سے روشنی آ رہی تھی جو کہ بہت کم تھی۔ پھولوں کی مہک میں اس کا حسین نخرہ اچھو کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سیاہ بالوں میں سجے گجرے اسے گدگدانے اور ستانے پر اکسا رہے تھے۔ اس نے بات کرنی چاہی مگر اس نے جل کر دل کا غبار نکالا۔

''بس' بس رہنے دے ماں کے سامنے مٹی کا مادھو بن جاتا ہے۔ مت لایا کر یہ ہزاروں کے گجرے۔ تیری ماں کو اصل دکھ ہے ہی ان گجروں کا۔''

''پگلی کہیں کی۔ وہ تیرے بھلے کو ایسا کہتی ہیں۔ ویسے ہم بھی تو کھلی چھت پہ سوتے ہیں۔'' اچھو نے ماں کی تائید کی تو وہ مزید سیخ پا ہو گئی۔

''ہاں' تو بولے گا ماں کی زبان۔''

''دیکھ اچھو استاد نے آج تک اونچی آواز میں کسی کی بات نہیں سنی۔ زیادہ بولے گی تو دماغ کی پھرکی گھوم جائے گی۔''

''پھر سو جا چپ کر کے۔'' وہ تڑخ کے بولی اور کھیس کھینچ کر خود پہ تان لیا۔

اچھو کی جان پہ بن گئی۔ وہ تو اپنی نئی نویلی بیوی سے ایک لمحے کو بھی خفا نہیں ہو سکتا تھا۔

''سن! اب موڈ ٹھیک کر لے۔ میں بے جی کو سمجھا دوں گا۔''

مگر پھر اگلے دن رابعہ نے صحن میں پلنگ بچھائے' پیڈسٹل فین لگایا۔ اچھو اسی وقت روز کی طرح خوبصورت گجرے اور کچھ پھل لیے گھر میں داخل ہوا۔ بے جی نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر جائے نماز طے کر کے پلنگ پر آ بیٹھیں۔ اچھو نہا کے تازہ دم ہو کے ان کے برابر والے پلنگ پر آ کر بیٹھا تو رابعہ جلدی سے کھانا لے آئی۔ تو اچھو نے کھانا شروع کر دیا۔ رابعہ اپنے کمرے میں گئی اور کچھ ہی دیر بعد ہمیشہ کی طرح بالوں میں گجرے سجائے کمرے سے باہر نکلی تو بے جی سے رہا نہ گیا۔

''جانے کس مٹی چون سے بنے ہو تم دونوں۔ روز ہی ایک بات پر کل کل ہوتی ہے۔'' بے جی کی بات پر اچھو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سالن کی پلیٹ صحن میں پھینک کر ماری اور چلایا۔

''بے جی! حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ تمہیں دس بیس کے گجروں کی اتنی تکلیف ہے۔'' بے جی جیتے اکلوتے اچھو کے منہ سے بہتے کف کو لمحہ بھر دیکھتی رہیں پھر فقط اتنا کہہ کر چلی گئیں کہ روز پھول گجرے لاؤ اور پہناؤ...... مگر...... چھت کے نیچے...... کھلی چھت پر ہزار ہواؤں کا گزر ہوتا ہے۔''

''بے جی! کوئی ہوائیں شوائیں نہیں ہیں۔ اپنی سوچ بدلو۔'' اس نے ذرا سی اونچی آواز میں کہا تاکہ اپنے کمرے میں بے جی سن لیں۔ رابعہ نے معصوم نگاہوں سے شوہر کو دیکھا تو اس نے لاڈ اٹھاتی نگاہوں سے اسے اوکے کا سگنل دے دیا۔ وہ اٹھلائی اور قلانچیں بھرتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی چھت پر چلی گئی۔ اچھو کچھ دیر کو ریڈیو کان سے لگا کر دل بہلانے لگا۔

اس واقعہ کے بعد بھی بے جی نے اسے گجرے پہن کر' خوشبو لگا کر چھت پر جانے سے روکنے کا کام جاری رکھا۔ تو رابعہ نے اپنا سامان باندھ لیا۔ اس کا بندھا سامان دیکھ کر بے جی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے ہمسائے سے بچہ بلایا اور اچھو کو بلانے کے لیے بھیجا۔ کچھ ہی دیر میں اچھو آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی رابعہ نے گردن موڑ کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

''یہ تیری بیوی بگڑ کے میکے جا رہی ہے اسے سمجھاؤ۔'' بے جی نے فقط اتنا کہا اور آلو چھیلنے لگیں۔

''رابعہ! یہ کیا حرکت ہے؟''

''کونسی حرکت......؟'' وہ پھنکاری۔

''یوں اچانک جانے کا پروگرام۔ کیا اکیلی جاؤ گی؟''

''ہاں!''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ گرجا۔

''برداشت کی حد ہوتی ہے۔ ایک ہی بات سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ نہ میں یہاں ہوں گی اور نہ چھت پہ جاؤں گی۔''

''ارے رابعہ بچی! اس طرح بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ میں تجربے کی بنیاد پر تمہیں منع کرتی ہوں۔ اچھو سے پوچھو اس کے تایا کی بڑی بیٹی پر آسیب ہوا تھا کہ نہیں۔ وہ بھی ہار پھول پہن کر رات کو گھر سے باہر نکلتی تھی۔ چلچلاتی دوپہر میں چھت پر جاتی تھی۔ کسی کی بات نہیں مانتی تھی نتیجہ کیا نکلا......؟''

''اوہو! بے جی! وہ محض اتفاق تھا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔'' اچھو نے بگڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسا جی چاہے کرو۔ میں تو منہ بند کر لوں گی۔'' بے جی نے بھرائی ہوائی آواز میں کہا اور چولہا جلانے لگیں۔ اچھو بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''چلو اب سامان واپس کمرے میں رکھو۔''

''ٹھیک ہے لیکن پھر بے جی نے روک ٹوک کی تو میں چلی جاؤں گی۔''

''اچھا بابا!''

''سامان لے آؤ......'' وہ ناز بھرے انداز میں آگے آگے چل دی۔ اچھو پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کے نزدیک بیوی کی حیثیت پیر و مرشد کی سی تھی جو کہہ دیا اس پر صرف آنکھ بند کر کے عمل کرنا ہے۔

اس واقعہ کے بعد بے جی نے مکمل چپ سادھ لی۔ زیادہ تر عبادت کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ چولہا چوکی بھی تقریباً چھوڑ دیا۔ جس کا رابعہ کو غصہ اور رنج تھا کیونکہ اسے کام کاج کی زیادہ عادت نہیں تھی۔ اب کافی وقت صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے میں لگ جاتا۔ اس نے اچھو سے دبے دبے لفظوں میں گھر کے لئے ملازمہ رکھنے کی خواہش ظاہر کی جسے اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ۔

''اچھو استاد سائیکل مستری ہے۔ کوئی مل کا مالک نہیں۔ گھر کا دھندا مشکل سے چل

رہا ہے۔''

یہ سن کر وہ تلملا کے رہ گئی مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اچھو پر یہ گمان تھا کہ وہ فرمائش پوری کر دے گا مگر اس نے سرے سے ہی مسترد کر دیا۔ بے جی سے تو وہ برائے نام بات کرتی تھیں۔ یا دوسرے لفظوں میں بے جی خود بہت کم اس سے بات کرتی تھیں۔ چند دن اسی طرح گزر گئے۔

رابعہ کے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جلدی جلدی کام کاج نپٹا کر اچھو کا انتظار کرتی۔ بجتی سنورتی' خوبصورت گجرے بالوں میں' کلائیوں میں پہنتی' الٹا سیدھا کھانا اچھو کے سامنے رکھتی اور چوکڑیاں بھرتی ہوئی چھت پر پہنچ جاتی۔ اچھو اس کی ہر ادا پر جی جان سے فدا ہوتا رہتا۔ وہ گھر میں سب کچھ لانا بھول جاتا مگر گجرے لانے ہرگز نہیں بھولتا تھا۔ رابعہ شان تفاخر سے بے جی کے سامنے گجرے پہن کر آتی اور اپنے تئیں انہیں جلاتی مگر آفرین تھی ان پر جو وہ کچھ کہتیں۔ انہوں نے تو جو نہ کچھ کہنے کا عہد کیا تھا اسے نبھا رہی تھیں۔

آج نارنجی سوٹ پہن کر تو وہ زیادہ ہی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ بے دھیانی میں کھانا پکانا بھول کر اچھو کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا انتظار اور بے چینی کی کیفیت صحن میں لیٹی بے جی غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جونہی دروازے پر اچھو کی سائیکل کی گھنٹی بجی وہ لپک کے دروازے پر گئی۔ دروازہ کھول کر سائیکل کے ہینڈل سے جھولتا گجروں کا شاپر اتار کے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد گجرے پہن کر باہر آئی تو قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھائے۔ مگر بے جی نے اس کے بڑھتے قدم روک لئے۔

''شوہر کے لئے دو روٹی ڈال دو۔ پھر چھت پر جانا۔''

اس کے قدم وہیں جم گئے۔ بے جی کی بات پر عملدرآمد کرنے کے بارے میں وہ ابھی غور کر ہی رہی تھی کہ اچھو صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''رابعہ! جلدی سے روٹی ڈال لاؤ بہت بھوک لگی ہے۔''

وہ نہ چاہتے چولہے کے پاس آ گئی۔ جلا کر چولہا جلایا' توا رکھا اور الٹی سیدھی' ٹیڑھی ترچھی دو روٹیاں پکا کر پلیٹ میں سالن ڈال کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

''پانی بھی لے آؤ.....'' اچھو نے کہا۔

وہ پانی کا گلاس بھر کے لائی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی وقت ایک

چھوٹی سی کاغذ میں لپٹی گیند نما چیز اس کے سر پر آ گری۔ وہ سی کر کے رہ گیا۔ پانی بنا پئے گلاس رکھ کے اس نے جلدی جلدی وہ سفید کاغذ میں لپٹی گیند اٹھا کر کھولنی شروع کی۔ کچھ ہی دیر میں ایک کاغذ اور چھوٹا سا پتھر اس کی ہتھیلی پر رہ گئے۔ اس کی نظریں کاغذ پر تھیں اور ہاتھ کی گرفت پتھر پر تھی۔

''رابعہ! سامان باندھ لو۔''

''ہیں! کیا ہوا.....؟'' بے جی چونکیں۔

''بے جی! رابعہ آسیب زدہ ہے اس کا علاج اس کے گھر میں ہے یہاں نہیں۔''

وہ خونخوار نظروں سے رابعہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ بے جی حیرت سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔ اچھو کے سنجیدہ لہجے نے انہیں چونکا دیا۔

''کیا کہہ رہا ہے تو اور یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' وہ بولیں۔

''بے جی! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ رات کو چھت پر گجرے پہن کر جانے سے سایہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ پر سچ مچ سایہ ہو گیا ہے۔ تایا جی کی بیٹی کی طرح۔ بے جی نے متحیر ہو کر کبھی اچھو کو دیکھا اور کبھی رابعہ کو..... جو نظریں جھکائے کلائی میں پہنے گجرے نوچ رہی تھی۔



پرانا سوٹ کیس

ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد اماں کی آواز مریم کے کانوں میں خاموش چپ چپ سی گھنٹیاں بجا گئی۔

''مریم! مریم! پروفیسر باری صاحب کے گھر والوں کو تم پسند آ گئی ہو۔ انہوں نے رشتے کے لئے ہاں کر دی ہے۔ یہ دیکھ ٹوکری بھر مٹھائی بھیجی ہے۔'' اس نے کانوں میں بجتی خاموش گھنٹیوں پر ہاتھ رکھ کے اماں کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ بڑی سی سرخ پنی میں لپٹی مٹھائی کی ٹوکری اماں نے انتہائی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔

''اب میں جاؤں اپنے کمرے میں۔'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ارے! تجھے خوشی نہیں ہوئی۔ تیرا رشتہ طے ہوا ہے۔'' اماں نے شاید خاموش گھنٹیوں کی کرلاہٹ سن لی تھی۔

''اماں! تو خوش ہے نا بس یہی کافی ہے۔''

''مریم! دیکھنا اللہ تجھے بہت سکھ دے گا۔''

''اماں! صرف یہ دعا مانگ کہ اللہ مجھے اولاد دے گا' کیونکہ پروفیسر صاحب کو بیوی نہیں اولاد چاہئے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں ہاں! اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔'' اماں کی جیسے سانس پھول گئی۔

''اب میں جاؤں دفتر سے تھک کر آئی ہوں۔''

''بس بہت ہو گئی نوکری۔ اب چھوڑ موئی نوکری کو۔ اللہ کے فضل سے پروفیسر صاحب کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔'' اماں نے کہا تو وہ تلخی سے مسکرا کر اپنے کمرے کی طرف

بڑھ گئی۔

اماں کو کیا بتاتی کہ پینتالیس سالہ پروفیسر کی کب سے مجھ پر نظر جمی ہے۔ آتے جاتے گلی میں سڑک پر ان کی گھورتی آنکھوں کا ہزار بار سامنا کیا ہے میں نے۔ یہ اولاد نہ ہونے کا تو محض بہانہ ہے۔ اگر اولاد کی خواہش تھی تو بیوی کا علاج معالجہ کراتے۔ اسے تین حرف سنا کر گھر سے باہر نہ نکالتے۔ انہیں اس دکھیاری پر ذرا رحم نہیں آیا اور میں' میں تو اپنا احساس بھی نہیں رکھتی۔ تو نے کب مجھے ہنستے مسکراتے دیکھا' کب میرے آنگن میں کوئی بچپن کی جوت جاگی۔ کب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ مجھے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ بس سیدھے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی طرف سفر کیا ہے میں نے۔ پینتیس سال کچھ کم تو نہیں۔ لڑکی کو عورت بنانے کے لئے بہت عام سی بات ہے۔ میں نے اپنا اور تیرا بوجھ اٹھانے کے لئے سب کچھ طاق میں رکھ دیا۔ کس نے دیکھا' کس نے نام پوچھا' کسی نے گھر آنے کی اجازت لی مگر میرے منہ میں تو زبان ہی نہیں تھی۔ میرے چہرے پر تو آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ اماں! میں نے تیری ناموس کی وجہ سے کسی کو نہیں دیکھا۔ تو نے ہی دیکھا میرے لئے جیسے سفید رنگ کو' میرے سرمئی بالوں کو' تو نے ہی تو گھر کے دروازے کی کنڈی چڑھا کر میرے بالوں میں مہندی لگائی تھی۔ دہائی بھی دی تھی۔

''ہائے میں مر جاؤں۔ تیرا تو سر سفید ہو گیا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو ساری زندگی یہیں بیٹھی رہ جائے گی۔''

''چل اچھا ہے اماں تجھے کوئی فکر نہیں کرنی پڑے گی۔''

''شش! چپ ایسی نحس باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔''

''اماں! تو نے دروازہ کیوں بند کر لیا ہے۔'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ ساتھ والوں کی زیبو کو منہ اٹھا کر گھسے چلے آنے کی عادت ہے۔ اگر وہ آ گئی تو دوسرے محلے میں اعلان کرتی پھرے گی۔''

اور اس دن سے تو نے خود بھی جھوٹ بولنا شروع کیا اور مجھے بھی سکھایا۔ ہر آٹھ دس دن بعد تو بالوں میں مہندی لگاتی اور میں دروازے کی دستک پر کمرے میں چھپ جاتی۔ تو دروازے کے پاس جا کر کہہ دیتی۔

''پتر زیبو! میں نہا رہی ہوں' شام کو آنا۔''

''تو نے میرے سرمئی بالوں کو لال سنہری رنگ دے دیا اور پھر رات دن فکر میں لگ گئی کہ کہیں سے کوئی شہزادہ لائے اور مجھے اس کے ساتھ رخصت کر دے اور دیکھ اماں! پورے چار سال بعد شہزادہ آ گیا۔ پروفیسر باری تو خوش ہے۔ تو خوش ہی رہے۔ میرا کیا ہے میرے پاس تو کل کچھ عام لڑکیوں جیسا تھا اور نہ آج کچھ خاص ہے۔ یہ بھی غنیمت کہ پروفیسر باری نے مجھ سے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے تو اس سے کچھ غرض نہیں کہ میں کیا ہوں؟ اور کیا ہونے والی ہوں؟

مریم! میری چندا اب تو پرائی ہوگئی ہے۔ اب صرف باری صاحب کے بارے میں سوچنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اداس سی گہری شام میں اس کے زرتاری دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے اماں نے سمجھایا۔ اس نے گردن ہلا دی۔ اماں کو مطمئن کر دیا۔ اماں کی پریشانی تو اسے کسی قیمت پر قبول نہیں تھی۔

اماں نے پروفیسر باری کے ساتھ رخصت کر دیا۔ وہ چپ چاپ چلی آئی۔ آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں چہرے پر سنجیدگی اور تناؤ سا آ گیا تھا۔ قریب کی سسرالی خاتون نے گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا تو منہ بنا کر بولیں۔

''ارے دلہن تو بہت پکی عمر کی ہے۔''

''تبھی تو اتنی سنجیدہ اور خاموش ہے۔ کم عمر دلہنیں ہی اٹھلاتی ہیں۔'' ان کے برابر کھڑی نارنجی سوٹ والی دوسری خاتون نے وضاحت کی۔

''ارے بھئی باری بھائی بھی تو اب نوجوان نہیں رہے۔'' تیسری کو اس پر رحم آ گیا۔

''ارے واہ! مرد بھی کبھی بوڑھے ہوئے ہیں کیا......؟'' ایک چوتھی کی زہر میں ڈوبی آواز آئی۔ اس کا دل چاہا کہ گھونگھٹ پھینک کر بھاگ پڑے۔ کہیں دور چلی جائے۔

''بس بہن! بعض ماں باپ لڑکیوں کو گھروں میں بٹھا کر بوڑھا کر لیتے ہیں۔''

''پلیز' پلیز! میرا سر چکرا رہا ہے۔'' وہ ناقابل برداشت حالت میں بولی۔ سر تھام لیا۔ تب سب کی سب خاموش ہوگئیں اور اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے لگیں۔ تپتے ذہن کو اس وقت سکون ملا جب پروفیسر باری نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے اسے پیار کی مسند پر بٹھایا۔ وہ یکلخت تمام کلفتیں بھول بھال گئی۔ اپنا آپ باری صاحب کے حوالے کرتے ہوئے وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ کچھ دیر پہلے کی رنجیدہ طبیعت اب بہل گئی تھی۔ اس

نے باری صاحب کیلئے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ تو اس پر محبتوں کی بارش برسا رہے تھے۔ ان کے سینے میں منہ دیئے وہ اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں تھی۔

مگر اگلے ہی دن ولیمے کی دعوت میں باری صاحب کے چچازاد بھائی نے مذاق ہی مذاق میں جانے کیا کچھ کہہ ڈالا...... وہ سکتے میں آ گئی۔

''آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے؟'' غیر متوقع سوال پر وہ وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''جی! کیا......؟''

''کمال کرتے ہو عمر! یار مریم کی پہلی شادی ہے۔'' باری صاحب نے اطلاع فراہم کی۔

''اوسوری! دراصل آپ کو دیکھ کر میں سمجھا کہ آپ بھی پہلے سے شادی شدہ ہیں۔''

''ویسے اتنی لیٹ شادی کیوں کی آپ نے۔''

''معاف کیجئے گا کہ شادی بیاہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔'' دوسرے سوال پر تو وہ بھنا گئی۔

''یار! تم کیا باتیں لے بیٹھے؟'' باری صاحب نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

بظاہر بات ختم ہوگئی مگر مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی وہ اماں اور باری صاحب کے ہمراہ اپنے گھر آئی تو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ تو آج بہت پیاری لگ رہی تھی کہیں سے بھی تو بوڑھی اور پکی عمر والی نہیں لگ رہی تھی۔ شاید اپنے آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور اپنے آپ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ غور سے انگلیاں رگڑ رگڑ کر چہرے کو ٹٹول رہی تھی۔

''ارے! بیگم صاحبہ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کیا میں سچ مچ پکی عمر کی لگتی ہوں......؟'' وہ پوچھ بیٹھی۔

''یہ کیسا سوال ہے؟'' باری مسکرائے۔

''مجھے غور سے دیکھئے اور بتایئے کہ میں۔''

''وہم نہیں کرتے لوگ تو وسوسے پیدا کرتے ہی رہتے ہیں۔''

''اور آپ کا دل......؟''

''کیا ہوا میرے دل کو؟ یہ تو آپ کا ہے۔''

''کل سے اب تک کس طرح میرے دل پر نشتر لگائے گئے ہیں۔''

''لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' باری صاحب نے ایک بار پھر اس کے دل پر وسوسوں کے چھائے جالے اتار پھینکے۔ وہ مسکرا دی۔

باری صاحب نے اس کی اداس زندگی کو رنگین کر دیا تھا۔ وہ سوتے جاگتے مسکرانے لگی تھی۔ صبح سے شام کیسے ہو جاتی یہ پتہ بھی نہیں لگتا۔ باری صاحب کالج جاتے اور واپس آتے۔ وہ صبح سے شام تک صرف ان کی ذات کے دائرے میں مقید ہو کر جینے لگی تھی۔ خوشیوں نے اثر دکھایا۔ اس کا نازک سا جسم بھاری بھرا ابھرا سا ہو گیا۔ جسم کے نشیب و فراز میں نمایاں تبدیلی آئی۔ باری صاحب اس کو خود سے قریب کر کے اس کی ناک سے اپنی ناک بچ کرتے اور سرگوشی کرتے۔ ''تم تو بہت نرم اور گداز ہو گئی ہو' میں تو تمہارے جسم کی نرمی میں کھو جاتا ہوں۔'' وہ لجا گئی اور بھول گئی کہ جسم گداز ہوتے ہوئے بے ڈول' بے ڈھنگا ہو گیا ہے۔ باری صاحب نے ہی ایک روز غور سے دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔

''مریم! تم مجھے چھ بچوں کی ماں لگنے لگی ہو۔'' وہ چونکی باری صاحب کے جملے نے دل پر چوٹ لگائی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر جسم کو محسوس کیا۔

''بری لگنے لگی ہوں۔''

''نہیں' بس بچوں کی ماں لگنے لگی ہو۔ حالانکہ ابھی ایسی کوئی خوشخبری تو تم نے سنائی نہیں۔'' موقع تاڑ کر باری صاحب نے دل میں آئی بات بھی کہہ ڈالی۔

''خوشخبری میں نے نہیں اللہ میاں نے سنانی ہے۔'' وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

''کچھ بھی کہو الزام تو عورت کے سر ہی آتا ہے۔''

''آپ! آپ بھی پڑھے لکھے انسان ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔''

''میں بھی تو اسی معاشرے کا انسان ہوں۔ تمہیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ نہیں سنائی دیتی کیا؟''

''اور آپ سنتے ہیں۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہونہہ! کیونکہ میں حقیقت پسند انسان ہوں۔''

''اور کیا سن رہے ہیں آپ؟'' وہ خوفزدہ سی بولی۔

''کچھ نہیں تم اپنا کام کرو۔'' وہ ٹال گئے۔ لیکن اس کے دل میں گرہ لگ گئی۔ وہ اندر ہی اندر سہم گئی۔ خوف اور پریشانی کے سہم نے ایک رات میں ہی اس کی چربی پگھلا دی۔ وہ برسوں کی مریض دکھائی دینے لگی۔

اماں اس کی زرد رنگت اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

''مریم! کیا ہوا تجھے؟''

''بس زہر کے موسم نے یہ حال کر دیا ہے۔''

''ہیں کیا بک رہی ہے۔''

''ک...... کچھ نہیں بس تو میرے ساتھ چل' چل جلدی کر۔''

''پر کہاں......؟'' اماں بولا سی گئیں۔

''لیڈی ڈاکٹر کے پاس۔''

''کیوں...... کیا ہوا؟''

''بس کچھ پوچھنا ہے تو چل میرے ساتھ۔''

''تو نے باری صاحب سے پوچھ لیا ہے کیا؟''

''کیوں ان سے پوچھنے کی ضرورت......؟''

''ضرورت ہے پاگل وہ تیرے شوہر ہیں۔ خواہ مخواہ الٹا سیدھا سوچیں۔''

''کیا......؟''

''بچے! آج ان سے اجازت لے لو' کل چلے چلیں گے۔'' اماں نے اس پر ٹھنڈا پانی ڈال کر ڈھیر کر دیا۔ جس جذباتی انداز میں وہ آئی تھی اس سے کہیں سرد قدموں کے ساتھ واپس ہو گئی۔ رات جیسے ہی ہنستے مسکراتے باری صاحب آئے اس نے روایتی بیوی کی طرح کھانے کا پوچھا۔ جواب نہ میں ملا۔ وہ گنگناتے ہوئے کمرے کی طرف چل دیئے۔ وہ بھی پیچھے پیچھے آئی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے......؟''

''اس نے پوچھتے ہی سر جھکا کر مدعا بیان کر دیا۔

''ارے چھوڑو کن جھمیلو میں پڑ گئی ہو۔'' وہ حیران رہ گئی۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ڈاکٹر کو ملنا ضروری ہے۔''

''اچھا مل لینا بس۔'' وہ مطمئن ہوگئی۔ وہ چینج کر کے بستر پر دراز ہوئے اور کروٹ لے کر سو گئے۔ وہ رات بھر تانے بانے بنتی رہی کہ ڈاکٹر نے امید افزا بات کی تو کیسا لگے گا اور اگر میرے منہ میں خاک......'' اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہ سوچ سکی۔ رات بیت گئی۔ صبح وہ بہت حرکت میں تھی۔ جلدی جلدی تمام کام نپٹائے' جونہی باری صاحب گئے وہ اماں کو لے کر لیڈی ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد امید دلائی۔ چند ٹیسٹ لکھ دیئے وہ پھر شوہر کی منت سماجت کرنے کیلئے گھر آ گئی۔

''آپ کے اور میرے ٹیسٹ ہونے ہیں۔'' اس نے باری صاحب کے سر پر بم پھوڑ دیا۔ ان کے منہ سے چائے کلی کی شکل میں نکلی اور قمیص داغدار کر گئی۔

''کیا...... دماغ خراب ہوا ہے ڈاکٹر کا......؟''

''کیوں؟''

''ٹیسٹ کراؤ تم' میرا کیا دماغ خراب ہے؟''

''ہمیں دونوں کو کرانے ہیں۔''

''بکومت اور خود جو چاہو ٹیسٹ کراؤ ویسے بھی یہ مسئلہ ہوتا ہی عورت کا ہے۔'' وہ شان بے نیازی سے گردن اکڑا کر بولے۔ مریم تو جیسے زروں میں بٹ گئی۔ سماعت پر یقین نہیں آیا۔ دوبارہ پوچھ بیٹھی تو جواباً چائے کا کپ اس کے قدموں میں آ گرا۔ بری طرح سہم گئی۔

''دیکھو! صوفیہ بیگم کو بھی میں نے ہی ٹیسٹ میں ڈس کوالیفائیڈ کر کے سوٹ کیس تھمایا تھا۔'' مریم کی سماعت اب تو جواب ہی دے گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ بارود کی دیوار میں چن دی گئی ہو اور اس بارود سے صوفیہ کی دبی دبی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چکراتے سر کو تھام کر رہ گئی۔ وہ اٹھ کر چل دیئے اور وہ وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

اماں کے کندھے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''مریم! رونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مرد سیلن زدہ دیوار ہوتا ہے۔ ایک تہہ جھاڑو گی تو دوسری آ جائے گی۔ صوفیہ کی گرد دبا دے کہیں' تیرے قدموں سے بھی نہ لپٹے' جھاڑ

دے۔'' اماں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اماں! میرا دل ڈرا ہوا ہے۔ کہیں میں بھی سیم کی تہہ تو نہیں۔''

''امید تو یہی ہے مگر کہا نا کہ مرد کا اعتبار ہی کتنا ہوتا ہے۔''

''اب میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں بس چپ رہ۔ ایک طرف رہ اس کے رستے میں نہ آ۔''

''ڈاکٹر کے ٹیسٹ کراؤں کہ نہیں۔''

''کرالے یہ جتن ہے' جتن کر لے' اللہ اچھا کرے گا۔''

اماں کے کہنے کے مطابق اس نے اپنے تمام ٹیسٹ کرائے۔ تین دن بعد رپورٹ آ گئی۔ وہ کھل اٹھی کہ وہ نارمل ہے۔ اس میں کوئی فالٹ نہیں ہے۔ یہ خوشخبری سنانے کے لئے وہ جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی مگر باری صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ پل پل جی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ باری یہ خبر سن کر خوش ہوں گے۔ اس نے اچھی طرح بن سنور کر شیشے میں اپنا جائزہ لیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں تو کھچڑی بالوں نے چونکا دیا۔ دوڑ کر اماں کے پاس پہنچی۔

''اماں! دیکھ میرے بال کتنے خراب ہوگئے ہیں۔ مہندی لگا دے۔''

''مریم! تیرے بالوں کا اصل رنگ باری صاحب سے چھپا نہیں۔ یہ معاملہ تو بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ تیرے اور ان کے بیچ یہ بال نہیں آئیں گے۔''

''مگر اماں! وہ مجھے بچوں کی ماں کہتے ہیں۔''

''کہنے دو اسے کس کس بات سے روکو گی۔ جو حالات ہیں اس میں پلڑا قسمت کا بھاری ہوگا۔ اماں نے اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔ وہ مردہ قدموں سے لوٹ آئی۔ اسی رات باری آ گئے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ عین دروازے کے بیچ کھڑے تھے۔ کندھے پر بیگ کی جگہ دائیں ہاتھ میں نیا سوٹ کیس تھا۔ اس کا دل کانپ سا گیا۔ جانے کیوں باری کے چہرے پر کچھ نیا نیا تھا۔ وہ راستے سے ہٹ گئی۔ وہ اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے ایک نوخیز کلی دھانی آنچل میں سمٹی سمٹائی دروازے سے داخل ہوئی۔ وہ لرزی۔ باری پلٹے اور گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

''مریم! یہ نیا سوٹ کیس عائشہ کا ہے۔ اسے میرے کمرے میں رکھ دو۔''

"جی!" میں کھسیا سی گئی۔

"آؤ عائشہ میرے ساتھ آؤ۔" وہ اس کو نظر انداز کر کے عائشہ سے مخاطب ہوئے۔

عائشہ نے قدم اٹھائے تو اس میں برقی رو دوڑ گئی۔

"ٹھہرو! یہ میرا گھر ہے' کون ہے یہ......؟"

"نئے سوٹ کیس سے بھی کچھ نہیں پہچانا۔"

"نیا سوٹ کیس' کیوں ہے یہ نیا سوٹ کیس......؟" وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔

"رکو! میں آتا ہوں۔" باری یہ کہہ کر تیز قدموں سے اندر آ گئے اور اس کا سوٹ کیس اٹھا لائے۔ اس کے قدموں میں پھینک کر بولے۔

"اس نئے سوٹ کیس سے بدلا ہے یہ پرانا سوٹ کیس۔ اٹھاؤ اور جاؤ۔"

انہوں نے نئے چمکتے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرا قصور......؟" وہ سسکاری بھر کے بولی۔

"کوئی ایک قصور ہے تمہارا۔ مجھے پتہ ہے پکی عمر کی عورت سے اولاد نہیں ہو سکتی۔ میں لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر یہ کم عمر بیوی لایا ہوں اور معذرت کے ساتھ تمہیں جانا ہو گا۔" وہ بے رحمی سے بولے۔ وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے نیا سوٹ کیس گھورنے لگی۔ ہونٹ سل گئے۔ کیسے بتاتی کہ وہ نارمل ہے۔ مسئلہ تمہارا ہے۔" اس بات پر یقین کون کرتا۔ سیم زدہ دیوار کی تہہ کون صاف کرتا۔ اس نے جھک کر اپنا پرانا سوٹ کیس اٹھا کر سینے سے لگایا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے کیونکہ پرانے سوٹ کیس کی اب کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔

◈ ...... ◈ ...... ◈

خواہش کا سراب

گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے موٹر سائیکل کی رفتار بالکل کم کر دی۔ چلچلاتی دھوپ سے نکل کر گلی میں کچھ کچھ سایہ تھا۔ اونچے اونچے مکان اور چوباروں کی وجہ سے دھوپ کہیں کہیں پڑ رہی تھی۔ جولائی کی گرمی پورے جوبن پر تھی۔ پھر بھی گلی کے سناٹے میں چند بچے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ پسینے سے شرابور بھیگے کپڑوں میں دھن کے پکے اور شوق کے سچے' پورے انہماک سے کھیل رہے تھے۔ مجھے ان کا کھیل دلچسپ لگا۔ میں نے ایک طرف کچھ دیر کو موٹر سائیکل روک لی۔ وہ آپس میں اپنی اپنی زبان میں' اپنے اپنے انداز میں چیخ چلا رہے تھے۔ ایک گندمی رنگ کے بھرے بھرے بدن والے بچے نے باؤلنگ کرائی تو کالے سے سوکھڑے بچے نے طاقت سے بڑھ کر شارٹ لگایا۔ گیند دائیں ہاتھ کے گھر کی کھڑکی سے ٹکرائی اور شیشہ چھناکے سے کرچی کرچی ہو گیا۔ ان سب پر خوف کا سہم سا طاری ہو گیا۔ ایک دو ذرا دور فیلڈنگ کر رہے تھے وہ الٹے قدموں بھاگ کھڑے ہوئے البتہ چار اپنے قدموں پر جمے کے جمے رہ گئے۔ اس گھر کے داخلی دروازے سے بھاری سی خاتون باہر آ گئیں اور پھر بس۔

"ارے کالے کوئے' منحوس' ہاتھی جیسی آنکھوں والے' بن مانس' نامراد' بندر کی اولاد! کر دیا نقصان۔ تیرا باوا لگوائے گا شیشہ مردار گدھ۔" آناً فاناً خاتون نے سب کے سب بدشکل جانوروں کے نام لے ڈالے۔ بچے سہم کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر میرے سر پر جیسے سورج نے پڑاؤ ڈال لیا۔ دماغ غصے سے سلگ اٹھا۔ دل چاہا کہ اس خاتون کو چٹیا سے پکڑ کر ایسی پٹخنی دوں کہ یاد رکھے اور کہوں کہ۔

''اسے بھی تیرے جیسی کسی نے جنا ہے' گورا چٹا خوبصورت جنتی ہو تو سینہ تان کر نام لیتی ہو اور اگر ایسا پیدا ہو جائے تو جانوروں کے قبیلے میں پہنچا دیتی ہو۔''

میری زندگی میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا جب لڑکپن تھا تب سے میں بھی اسی طرح کے القابات سے پکارا جا رہا ہوں۔ شاید پیدا ہوتے ہی دائی نے مجھے کالا کوا کہا ہو اور میری ننھی ننھی آنکھیں دیکھ کر میری دادی نے ہاتھی کی آنکھوں والا کہا ہو اور میری ماں کو بھی مجھ میں گدھ' بن مانس جانے کیا کیا نظر آیا' ہو اور پھر دل پر پتھر رکھ کر روایتی ماں کی طرح اس نے مجھے میرا چاند کہہ کر گود میں چھپا لیا ہو۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ ہر حسین شے پر جونہی میری نظر پڑتی فوراً ہی مجھے اپنی اصلیت جاننے کا موقع مل جاتا۔ ٹی وی پر جوتے کپڑوں کے اشتہار میں دکھائے جانے والے بچوں' جیسے کپڑوں کا تقاضا کرتا تو ماں فوراً جھڑک کر کہہ دیتی۔

''ارے سڑ لئے کبھی شیشے میں شکل بھی دیکھ لیا کر۔'' میں دل مسوس کر رہ جاتا۔ یہ مشق جاری رہی۔ میرے اندر ماں کے لئے بھی غم و غصہ رہنے لگا۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا کہ میں بدشکل تھا۔ حسین تو میرے دوسرے بہن بھائی بھی نہیں تھے لیکن گزارہ تھے۔ میں بالکل ہی ناقابل برداشت نظر آتا تھا۔ ابا اماں کبھی کبھی میری طرف توجہ دیتے۔ یہ توجہ ہی تھی کہ انہیں جب میں چھ سال کا ہو گیا تو سکول میں داخل کرانے کا خیال آیا۔

سکول کی زندگی میں پہلی مرتبہ میں حسین عورت سے متاثر ہوا۔ میری کلاس ٹیچر مس گلنار۔ وہ سچ مچ گلنار تھی۔ جو رنگ پہنتی اسی رنگ میں سنور نکھر جاتی۔ میں میز پر کہنیاں ٹیک کر ہاتھوں کا پیالہ بنا کر چہرہ اس میں رکھ کر ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا۔ وہ کیا پڑھاتی؟ کیا سمجھاتی یہ میں نے کبھی نہیں جانا۔ ایک روز مجھے اپنے پاس بلا کر سمجھانے کے لئے اشارہ کیا تو میں چونک کر دوڑتا ہوا پاس چلا گیا۔ خوبصورت گورے ہاتھ میں پنسل پکڑ کر وہ کاپی پر لکھنے لگی تو میں نے اپنا کالا سوکھڑا سا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے وہ میری بچکانہ حرکت سمجھ کر مسکرا دی۔

مگر میں نے پھر ایک مرتبہ تو حد ہی کر دی۔ سردی کے موسم میں کاپیوں کا ڈھیر سامنے رکھے وہ کلاس روم کے باہر دھوپ میں کاپیاں چیک کرنے میں مصروف تھی۔ دھوپ کی تمازت سے چہرہ دہک رہا تھا۔ بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ میرے قدم بڑھے اور میں نے پیچھے جا کر چہرے پر آنے والے بال ہاتھ میں سمیٹ لئے۔ وہ جھٹکے سے پلٹی تو حیران رہ گئی۔

''میں آپ سے شادی کروں گا۔'' بے دھڑک ہی میں نے کہہ دیا۔ ان کے حسین

چہرے پر غصے کی سرخی آئی اور ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''جیسے نظر آتے ہو اندر سے بھی ویسے ہی ہو۔'' میں نے چند لمحے رک کر جملے پر غور کیا اور پھر کچھ نہ سمجھ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ مگر یہ بات جلد ہی میری سمجھ میں آ گئی کہ مس نے میری شکل صورت پر طنز کیا تھا۔ وہ طنز میرا ارادہ بن گیا کہ میں شادی جب بھی کروں گا کسی حسین لڑکی سے کروں گا۔

جیسے تیسے میٹرک کیا۔ ابا نے کرائے کی دوکان لے کر ایک فوٹو سٹیٹ مشین رکھوا دی۔ صبح سے شام تک مشین کی حرکت کے ساتھ میں حرکت کرتا رہتا۔

ابا' اماں کو اب مجھ پر کچھ پیار آنے لگا تھا۔ دن بھر کی کمائی جب اماں کی ہتھیلی پر رکھتا تو اماں میرا چاند کہہ کر میری پیشانی چوم لیتی۔ بہن بھائیوں میں' میں تیسرے نمبر پر تھا۔ بڑے بھیا اور ثریا باجی کے بعد مجھ سے چھوٹے شاہدہ اور نفیس تھے۔ بڑے بھیا کی لاہور میں ملازمت ہوئی۔ وہیں انہوں نے پسند کی شادی کر لی۔ ثریا شادی کے بعد سعودی عرب چلی گئی۔ ایسے میں پورے گھر کے اخراجات میرے ذمے تھے۔ ابا بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ ریلوے سے ملنے والی معمولی سی پنشن ان کا واحد ذریعہ آمدن تھی۔ وہ سارا دن گھر کے کام کاج کرتے اور کچھ وقت میرے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میری خواہش بھی توانا ہوتی گئی کہ مجھے حسین ترین لڑکی سے ہی شادی کرنی ہے۔

میری خواہش کو عملی شکل نرگس کی صورت میں ملی۔ ہمارے محلے میں گھر سے چوتھا گھر ٹھیکیدار رفیق کا تھا جو کرائے پر چڑھا تو نرگس کی خوبصورتی کے چرچے پورے محلے میں ہونے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں بار بار اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا۔ میری نظریں اس کے دروازے کھڑکی پر لگی رہتیں۔ ایک روز میں موٹر سائیکل ٹھیک کرنے کے بہانے دروازے کے عین سامنے رک گیا۔ میری مراد پوری ہو گئی۔ سیاہ چادر اوڑھے وہ مہ جبیں' پری وش اپنی ماں کے ساتھ باہر نکلی۔ ماں نے تالا لگایا اور دونوں میرے سامنے سے گزر کر آگے چلی گئیں۔ میری سانس جیسے کہیں اٹک گئی تھی۔ دل کی دھڑکنوں کا شور انجن کی آواز میں بدل گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر اس کا حسین چہرہ رقصاں تھا۔ دل نے اعلان کر دیا کہ اسی سے شادی کرنی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ میرا کہیں دل نہ لگتا۔ میں بہانے بہانے سے گلی کے چکر لگانے لگا۔ دو تین مرتبہ سے زیادہ وہ نظر نہیں آئی۔ میں بہت اداس تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا۔

بات کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک شام یہ موقع ہاتھ آ گیا۔ میں ابا کی دوا لینے کیلئے رات کو باہر نکلا تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گلی میں مکمل سناٹا تھا۔ میں نے نہ دل کو روکا اور نہ کوئی خیال کیا۔ کھڑکی کے پاس بالکل پاس جا کر مخاطب کیا۔

''نرگس! میں تمہارا دیوانہ ہوں۔''

''ہا، ہا!'' وہ ہنسی اور بولی۔

''کالے کوے پہلے جا کر آئینہ دیکھ۔'' اس نے کھٹ سے کھڑکی بند کی اور میں جیسے زمین میں گڑ گیا۔ میں نے چور نظروں سے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر پیشانی پر آیا ندامت کا پسینہ میں نے بازو سے صاف کیا اور آگے چل دیا۔

اس واقعہ نے مجھ پر خاصا اثر کیا۔ روٹی پانی سب برا لگنے لگا۔ بس چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہتا یا پھر برآمدے کی دیوار پر لگے شیشے کے سامنے جا کر خود کو دیکھنے لگتا۔ نرگس کا ایک ایک لفظ سچ ہی تو تھا۔ کہاں وہ اور کہاں...... مجھے بھی اس سے محبت نہیں تھی۔ میں تو اس کے حسن پر لٹو ہو گیا تھا۔ اس نے اس طرح بے عزت کیا تھا کہ خود کو بمشکل تمام سنبھالا۔ ویسے بھی اماں نے عینک کے شیشوں میں سے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔

''ارے چندا! کیا روگ لگا لیا ہے۔ میں تو تیری شادی کرنے کی فکر میں ہوں۔ میں نے تیری خالہ بلقیس کو عارف والا کہلا بھیجا ہے کہ اپنی نند کی بیٹی شبنم سے میرے انیس کا رشتہ پکا کرے۔ جب کہو گی آ کر شادی کی تاریخ طے کر جائیں گے۔'' اماں نے دو طرح سے مجھے چونکایا ایک شادی کی بات کر کے دوسری پہلی مرتبہ شاید میرا اصل نام لے کے۔ مجھے حیرت میں دیکھ کر اماں اور زیادہ دلار سے بولیں۔

''ارے میرے چندا! شبنم تو ایسی ہے کہ نظریں جمی رہ جائیں۔ سارا محلہ دنگ رہ جائے گا۔ میرا ارمان ہے کہ بس شبنم ہی میری بہو بنے۔'' اماں کی بات سن کر میرا چہرہ کھل اٹھا۔ نرگس کا دبا زخم ایک دم ہی بھر گیا۔ مجھے دراصل نرگس سے محبت ہوتی تو کیفیت مختلف ہوتی۔ اب تو جیسے اماں نے جادو کی چھڑی سے چھو کر میری بھوک پیاس سب جگا دی۔ میں نے رج کے کھانا کھایا اور پھر سے کام میں مصروف ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے اماں شبنم کے حسن کے قصیدے پڑھتی رہتیں اور میں بنا دیکھے ہی شبنم کے حسن سے متاثر ہوا جا رہا تھا۔ میں نے زور

شور سے کام شروع کر دیا۔ اماں نے شادی کی تیاری بھی شروع کر دی تھی اور میں نے دل ہی دل میں شبنم کے سنگ زندگی کے حسین سپنے بھی سجا لئے تھے۔ میں اپنی بدصورتی سے مکمل طور پر غافل ہو گیا تھا۔

مگر جونہی اس عورت نے اس کالے سوکھڑے لڑکے کو جانور نما انسان ثابت کیا تو میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ بدصورت لڑکا ہو یا مرد اسی طرح پکارے جاتے ہیں۔ میرے اعصاب پر ایکدم ہی شبنم طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ ہاتھ نچا نچا کر مجھے کہہ رہی ہے۔

''کالے بچھو! کہاں سے تو میرے پلے پڑا ہے۔ میری ماں نے تو میری قسمت پھوڑ دی۔ تیرے جیسے گدھ سے شادی کرنے سے بہتر تھا کہ میں زہر پی لیتی۔'' مجھ پر جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس نے مجھے زہر میں بجھی آواز سے سکتے سے نکالا۔

''تجھ جیسے سے تو میں جوتی نہ اٹھواتی اپنی شکل دیکھ کر کسی بدشکل سے شادی کرنی تھی۔'' میں جیسے گونگا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ میری آواز کہیں دور چلی گئی تھی۔ وہ ہنکار بھر کے مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ میرے اعصاب جواب دے گئے۔ میں چلا اٹھا۔

''نہیں، نہیں شبنم تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔'' میری آواز سب گھر والوں نے سنی۔ اماں تو تعجب اور حیرت سے بھاگ کر میرے قریب آ بیٹھیں۔

''انیس! باؤلا ہو گیا ہے کیا تو...... ارے ابھی تو شبنم اس گھر میں آئی بھی نہیں۔ کہاں چھوڑ کر چلی گئی؟'' میں کھسیانا ہو گیا۔ انہیں کیا بتاتا کہ میں کس حالت میں ہوں۔

اماں نے میری کیفیت کے پیش نظر شادی کی تیاری میں تیزی پیدا کر دی۔ عارف والا بھی خالہ بلقیس سے فون پر رابطے شروع کر دیئے۔ جیسے ہی وہاں سے اوکے کا سگنل ملا اماں اور ابا تاریخ لینے چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ بقول اماں کے شبنم حسین ترین لڑکی ہے تو کیا شبنم کے گھر والوں نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔ میں معمولی بدشکل انسان نہیں بلکہ اس معاملے میں تو قدرت نے بے پناہ فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر وہ اپنی خوبصورت لڑکی مجھے دینے پر کیوں تیار ہو گئے۔ میں یہ سوچ رہا تھا۔ میری سوچ کا پرندہ اڑتے اڑتے پھڑپھڑا کر فرش پر آ گرتا۔ میں نے انگلیوں پر اپنی شخصیت کی تمام خوبیاں گن ڈالیں۔ جو بہت کم تھیں۔ ان سب پر بھاری میری بدصورتی تھی۔ تو کیا شبنم مجھے قبول کر لے گی۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ ابا اماں واپس آئے۔ سارے محلے میں مٹھائی تقسیم ہوئی۔ مجھے یقین آ گیا کہ میری دلی مراد پوری ہونے کو ہے۔ میں نے خوشی اور بے قراری میں ہر شے بھلا دی۔ خوب کام کیا۔ ڈھیرے سارے پیسے اماں کو دیئے۔ اپنے کمرے کو نت نئے انداز میں سجا ڈالا۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ صرف پچیس دن گھر کے سب افراد ہی مصروف ہو گئے تھے۔ بڑے بھیا اور آمنہ بھابی دس روز پہلے ہی آ گئے۔ ثریا باجی اور دولہا بھائی سعودی عرب سے نہیں آ سکتے تھے۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ اماں نے میرے لئے اپنے ہاتھوں سے ابٹن بنایا اور پھر رات ڈھولک بجتی' گانے گائے جاتے۔ مایوں والی رات میں کچھ پرسکون ہو گیا۔

''شاباش! تو آرام کر دل خراب نہ کر۔'' اماں دلاسا دے کر چلی گئیں اور میں شبنم سے مخاطب ہو گیا۔ جانے کیا کیا اس سے کہتا رہا۔ وعدے لیتا رہا۔ وہ شرم سے نظریں جھکائے میرے سامنے بیٹھی رہی۔ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا اس لئے میرے تصور نے کبھی اسے نرگس بنایا اور کبھی مس گلنار۔ لمحے لمحے میں میری پتلیوں پر عکس بدلتا رہا اور میں ان دونوں کو شبنم کہہ کر پکارتا رہا۔ اس لمحے وہ دونوں ہی شرمگیں تھیں۔ گلنار سی تھیں۔ نہ ان کی زبان سے زہر نکلا تھا اور نہ نشتر لگے تھے۔ میں گویا جنت کے کسی گوشے میں تھا وہیں نیند آ گئی۔

اماں کی باتوں کا اثر تھا کہ میں ایک نارمل خوش باش دولہا بن کر شبنم کو بیاہ لایا۔ میری بے تاب نظروں نے ترچھی اور ٹیڑھی ہو کر شبنم کا حسین روپ دیکھ لیا تھا۔ اماں نے سچ ہی کہا تھا وہ سرتا پیر دودھ اور سیندور سے گندھی تھی۔ اس کے ملکوتی حسین چہرے پر نظریں جم سی گئی تھیں۔ سنہری زرتاری آنچل میں' زیورات اور میک اپ سے سجا چہرہ اور حسین ہو گیا تھا۔ دودھ پلائی کی رسم کے موقع پر میری سالیاں' شبنم کی کزنز چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ ایسے میں سب ہنس رہے تھے مگر شبنم کے چہرے پر خاموش مسکراہٹ تھی۔ یہ بات اب تک اسی طرح اس کے چہرے پر تھی۔

سارے محلے کی عورتیں' لڑکیاں اماں کو' آمنہ بھابی کو' شاہدہ کو بدھائی دے رہی تھیں۔ اتنی حسین دلہن لانے پر مبارکباد دے رہی تھیں۔ اماں کی زبان ماشاءاللہ کہتے کہتے نہ تھک رہی تھی۔ اماں کو سفر سے تھکی شبنم کا پورا خیال تھا۔ اسے کچھ دیر آرام کرنے کے لئے اماں نے اپنے کمرے میں لٹا دیا۔ شاہدہ بڑھ بڑھ کر اس کی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ چائے پی کر

وہ پرسکون ہو کر سو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ پلکیں موند کر مسہری کی پشت سے سر ٹکا کر جانے کیا سوچنے لگی۔ رات کا ایک بج رہا تھا تب اماں نے آمنہ بھابی سے کہا کہ شبنم کو انیس کے کمرے میں لے جاؤ۔

شاہدہ اور آمنہ بھابی نے ایک بار پھر اسے نئے سرے سے سجا بنا کر میرے کمرے میں پہنچا دیا۔ بھابی مجھے کھینچ کر کمرے میں لائیں۔ انہوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور ہنس کر باہر چلی گئیں۔ میں نے دیکھا وہ کوئی بھی تاثر دیئے بغیر گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے دھڑکتے دل کو بمشکل قابو میں کیا اور کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ چپ تھی۔ کمرے میں صرف وال کلاک کی سوئیوں کا شور تھا۔ جہاں ہندسے بدل رہے تھے۔ ایک دو میں بدل گیا اور دو تین میں..... تب میں نے دیکھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور دھیرے سے بولی۔

''آپ آرام کر لیں۔'' میں نے عجیب استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے کوئی تھکن نہیں ہے۔'' اس نے شاید میرا مطلب سمجھ کر کہہ دیا۔

''کس تھکن کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔

''سفر شروع کرنے سے پہلے کی تھکن۔'' وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

''شبنم! میری طرف دیکھو۔ کیا مجھے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''حوصلہ کیا ہے تو تھکن اتری ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہہ دیا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں بھی مجھے دیکھنے کے لئے حوصلے کی ضرورت پڑی ہے۔''

''دیکھنے کی نہیں' اپنانے کی' قبول کرنے کیلئے۔ ایک طرف تھکن تھی اور دوسری طرف حوصلہ۔''

وہ دھیرے سے ہاتھ چھڑا کر بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں جلدی سے بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔

''شبنم! شبنم! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بس تم نے مجھے قبول کر لیا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔'' میں نے کھینچ کر اسے قریب کر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مگر وہ

گھڑی جسے وصل کی گھڑی کہتے ہیں' ملاپ کی گھڑی کہتے ہیں۔ اس گھڑی اس نے جھٹک کر خود سے دور کر دیا۔ میرا ہاتھ اس کے کرتے کے بٹنوں میں پھنسا رہ گیا۔ جیسے اجنبیت سے اسے اپنے ہاتھ سے الگ کیا اور پائنتی کی رخ پر سکڑ کر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئی۔ میرے لئے یہ لمحات ناقابل برداشت تھے۔

''معاف کرنا ایسے لمحے کبھی ہماری زندگی میں نہیں آئیں گے۔'' اس کی بے باکی پر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں مجھ جیسا بدشکل آدمی قبول نہیں۔''

''اگر ایسا ہوتا تو گزشتہ دو تین سالوں میں جتنے رشتوں سے میں انکار کر چکی ہوں ان میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا۔''

''جو کہنا ہے صاف صاف کہو'' مجھے کچھ غصہ آ گیا۔

''مجھے غور سے دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ مجھے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میری گردن سے گزرنے والا پانی بھی صاف نظر آتا ہے۔ میری بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نشہ چھلکتا ہے۔ میرے ہونٹوں سے سنگتروں جیسا رس ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ میرے ہاتھ نرمی و نزاکت میں ریشم کو شرماتے ہیں۔ میرے جسم کو بے پردہ کر دیکھ لیا تو پھر کہیں اور یہ پیاس بجھے گی نہیں جس کے پاس اتنے خزانے ہوں کیا اسے کوئی حق نہیں کہ وہ بھی اپنے دیکھنے والے کو اپنے جیسا دیکھے۔ مجھے بچپن سے حسین لوگ' خوبصورت چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ مگر جس گھرانے میں پیدا ہوئی وہاں دور دور تک یہ دونوں باتیں ناپید ہیں۔ نجانے میں کہاں سے قدرت کا کرشمہ بن کر پیدا ہوگئی۔

میرے حسن کے چرچے میری ساتھ جواں اور دلکش ہوئے۔ مگر دیکھنے والے وہ لوگ تھے جو میں دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بے پناہ حسین ہونے کی خبر اونچے ایوانوں تک پہنچتی نہیں دولت کی سیڑھی تھی نہیں جو میں آسمان تک پہنچتی۔ مجھے بدشکل لوگوں اور بدنما چیزوں سے شدید نفرت تھی۔ مگر جو بھی آیا وہ ایسا ہی آیا۔ پورے تین سال میں نے نفرت کی جنگ کا سامنا کیا۔ میں ٹوٹتی رہی بکھرتی رہی۔ میری ماں نے' میرے باپ نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اب جو رشتہ بھی آیا اس سے شادی کرنی ہوگی اور گلفام کے خواب دیکھنے چھوڑ دو۔ میں نے حالات کا بہت مقابلہ کیا۔ اپنے اندر کی شدید نفرت کو کھرچ کر باہر نکالا اور تمہارے رشتے کیلئے

ہاں کر دی۔ میری سکھیوں نے تمہیں دیکھ کر خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور میرے کان میں بتایا مگر میں چپ رہی۔ میں نے حوصلے کے ساتھ ایک فیصلہ کیا۔ وہ سانس لینے کو رک سی گئی۔

''کیسا فیصلہ......؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''شاید تم میرے فیصلے سے اتفاق نہ کرو۔''

''بتاؤ' جلدی بتاؤ' ساری رات بیت گئی ہے۔'' میں نے دور سے آنے والی فجر کی اذان کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ وہ ہنس دی۔

''میرے فیصلے سے کسی رات کا کوئی تعلق نہیں ہے انیس جی۔'' میں نے حیرانی سے دیکھا۔

''دیکھو! میں نے تمہیں حوصلہ کر کے روحانی طور پر قبول کر لیا ہے۔ پر جسمانی نہیں۔ میں ساری زندگی وفادار ملازمہ بن کر خدمت کروں گی مگر جسم پر ایک کھرونچ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ جذبوں کی تپش میں جل جاؤں گی پر......؟''

''پر' پر یہ کیا......'' میں نے اسے کچھ کہہ دینے سے روکنے کیلئے کہا اور گڑبڑا گیا۔

''آرام سے لیٹ کر میرا فیصلہ سنو۔ تمہیں اپنے بدشکل ہونے کا بخوبی احساس ہے۔ کیا کچھ نہیں سنا ہوگا تم نے۔ اور مجھے اپنے حسن پر ناز ہے۔ اس کے ہونے نے مجھے روح کی تھکن دی ہے۔ میں یہ تھکن ختم کر کے آئی ہوں۔ اسے آگے منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ جسموں کے ملاپ سے کوئی شبنم یا کوئی انیس دنیا میں آئے گا۔ پھر شبنم گلفام کی راہ دیکھے گی اور پھر انیس اپنے بدشکل ہونے کی سزا پائے گا۔ میں اپنی اولاد کو اس ورثے سے محفوظ رکھوں گی بس۔''

شبنم نے چیف جسٹس کی طرح فیصلہ صادر کر دیا۔ اور بیڈ سے اتر کر سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر تمام زیورات اتارنے لگی۔ اس کا عکس کہیں معدوم ہو گیا۔ اور شیشے میں زور زور سے قہقہے لگاتی ہوئی کبھی نرگس نظر آنے لگی اور کبھی مس گلنار...... شبنم ان دونوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس نے میری بدنمائی کا مذاق کتنے انوکھے اور منفرد انداز میں اڑایا تھا۔ کسی اور حسین کا انتظار اور ارمان بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے تمام عمر اپنے احساس کمتری کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ سوچ کر میں پوری توجہ سے اذان سننے لگا جس کی آواز نسبتاً قریب اور واضح تھی۔

◈ ...... ◈ ...... ◈

کھڑکی سے باہر

بالائی منزل پر میرا کمرہ مجھے ہر لحاظ سے اچھا لگتا تھا۔ روشن ہوادار' کشادہ' صاف ستھرا سوائے گرمی کے موسم میں گرم ہونے کے اپنے کمرے سے مجھے کسی قسم کی شکایت نہ تھی۔ گرمی کی شدت کو بھی کم کرنے کیلئے میں جیسے ہی بڑی سی شیشے کی کھڑکی کھولتی تو تازہ ہوا کے جھونکے فوراً کمرے میں داخل ہو کے ماحول کو اچھا بنا دیتے۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں تازہ ہوا کو خود بھی محسوس کرتی اور کمرے کے ماحول کو بھی بہتر کرنے کی اجازت دیتی۔ اس طرح کچھ وقت کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ ہماری کالونی خاصی پرسکون تھی۔ اس میں جدید طرز کے گھر اور کوٹھیاں تعمیر ہوئی تھیں۔ بہت امیر اور کچھ کم امیر لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمارے جیسے درمیانے طبقے کے لوگ بھی کالونی میں آباد تھے۔ جن کا امیر لوگوں سے برائے نام تعلق تھا۔ مگر سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ ایک روز میں نے شام کی تازہ ہوا کمرے میں داخل کرنے کے لئے کھڑکی کھولی تو میں ٹھٹکی۔ کھڑکی کے بالکل سامنے دائیں طرف ''روپ نگر'' سیٹھ امتیاز علی کی محل نما کوٹھی کے بالکل برابر خالی پلاٹ میں ایک جھگی بن گئی تھی۔ کوڑے اور ملبے کے ڈھیر کے عین درمیان جھگی کے باہر جھلنگے سے پلنگ پر ایک کمزور سا بچہ لیٹا تھا اور اس کے دائیں طرف سانولی سی ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکی تھی جو بچے کو دوپٹے کے پلو سے ہوا دے رہی تھی۔

بچے کے پیروں کی طرف ایک مرد تھا جو بچے کے پیر سہلا رہا تھا۔ میں نے یہ تو سمجھ لیا کہ یہ بچے کے ماں باپ ہیں اور بچہ یقیناً بیمار ہے۔ مگر میں یہ بالکل نہ سمجھ سکی کہ ''روپ نگر'' کے پہلو میں جھگی جیسی چیز کا قیام کب اور کیسے؟ کس کی اجازت سے عمل میں آیا۔ میں نے کچھ

ہی دیر میں گھر کے ملازم کے ذریعے یہ جان لیا کہ وہ میاں بیوی پردیسی ہیں۔ بچے کے علاج کے لئے بڑے شہر آئے ہیں۔ یہاں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے خالی پلاٹ میں جھگی بنا لی۔ بچہ شدید بیمار ہے۔ اس کے علاج پر کافی وقت لگے گا۔ ملازم نے اتنا بتایا تو آگے کی ساری بات میں نے خود جان لی۔

پھر چند روز میں مصروفیت کے باعث کھڑکی سے باہر نہ دیکھ سکی۔ اور کسی نے بتایا بھی نہیں۔ شاید کسی کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ بے بس بیچارے پردیسیوں کی خیر خبر رکھتے۔ اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے ملازم سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے فقط اتنا بتایا کہ بچہ اور اس کی ماں جھگی میں ہوتے ہیں اور مرد نے کہیں مزدوری کر رکھی ہے۔ وہ رات کو آتا ہے۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔

''مگر وہ تو بچے کے علاج کے لئے آئے تھے۔''

''پتہ نہیں جی' بس یہیں دوا دارو کر رہے ہیں۔'' ملازم نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جولائی کا گرم موسم عروج پر تھا۔ جھلسا دینے والی دوپہریں تھیں اور بے آرام کرنے والی راتیں۔ سب بارش کی دعائیں کر رہے تھے۔ اچانک گھٹائیں جھوم کے آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے زوردار بارش ہوئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں گئی۔ کمرے میں گھٹن تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولی۔ حسب عادت کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا تو منظر پریشان کن تھا۔ خالی پلاٹ پانی سے بھر گیا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ بارش کے پانی کے بیچوں بیچ...... دونوں کے چہروں پر پریشانی کی عبارت میں نے دور سے پڑھی۔ وہ بچے پر جھکے ہوئے تھے۔ شاید بچے کی حالت زیادہ خراب تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس مرد نے بچے کو گود میں اٹھایا اور پانی میں سے چلتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا۔

اس عورت نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ دعا کی اور پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ میں نے نظریں چرا کر ''روپ نگر'' کی طرف دیکھا۔ یہاں بہت گہما گہمی تھی۔ گاڑیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ کوئی آ رہا تھا اور کوئی جا رہا تھا۔ میں کچھ دیر بعد کھڑکی سے ہٹ گئی۔ بک شیلف سے کتاب نکال کر ورق گردانی شروع کر دی۔ مگر کوئی بے کلی سی تھی۔ بے اختیار پھر میں نے کتاب رکھ کر کھڑکی کا رخ کیا۔ باہر اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ جھگی اور پلاٹ

اندھیرے میں تھے۔ جبکہ ''روپ نگر'' میں روشنیاں تھیں۔ شور ہنگامہ تھا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ کھڑکی بند کر کے کمرے میں آ گئی۔

ایک عجیب سی بے چینی میرے اندر تھی۔ میں بے کل سی کمرے میں ٹہل رہی تھی کہ ایک دم عورت کے رونے کی آواز آئی۔ عورت کی سسکیاں اور مرد کی دبی دبی ہچکیاں واضح سنائی دے رہی تھیں۔ میں اپنے قدموں پر پتھر کی سل بن گئی۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھوں۔ کافی دیر ان دونوں کے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے۔ حوصلہ دے رہے تھے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ فضا میں چاروں جانب درد ہی درد پھیل گیا ہو۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔

اندھیرے میں دو سائے تھے۔ ان کی بے صدا آوازیں تھیں' آہیں تھیں۔ یقیناً ان کا بچہ مر چکا تھا۔ اس کی جدائی پر وہ تڑپ رہے تھے۔ دوسری طرف ہنسی اور قہقہوں کا شور تھا جس میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی لمحے ایک بڑی سی ویگن روپ نگر کے گیٹ پر رکی۔ گیٹ کھلتے ہی سیٹھ صاحب کے آٹھ دس ملازم ویگن کی طرف بڑھے۔ ویگن کا پچھلا دروازہ کھولا گیا۔ اس سے بڑے بڑے مٹھائی کے ٹوکرے اتارے گئے۔ میری نظریں خالی پلاٹ اور جھگی سے ہٹ کر روپ نگر کے مین گیٹ پر جمی تھیں۔ درجنوں مٹھائی کے ٹوکرے اتارنے کے بعد ویگن واپس چلی گئی اور پھر دو لمبی لمبی گاڑیاں' جن میں سے ایک سیٹھ امتیاز علی کی تھی اور دوسری ان کے بھائی سیٹھ اشتیاق علی کی تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئیں اور پھر میں کچھ نہ دیکھ سکی۔ صرف آوازیں تھیں جن کی گونج میں ان دونوں کی سسکیاں ڈوب چکی تھیں۔

میں بھی ان سے غافل پرشوق نگاہوں سے ''روپ نگر'' کے گیٹ اور در و بام کو دیکھ رہی تھی۔ جانے وہاں کیا ہوا تھا؟ نہ شادی تھی اور نہ سالگرہ...... رات کے گیارہ بجے اس قدر گہما گہمی کا سبب کیا تھا؟ میرے تجسس اور اشتیاق کی کیفیت نے مجھے کھڑکی میں کھڑے رہنے پر مجبور رکھا۔ میری نظریں آتی جاتی گاڑیوں اور ان سے اترتی سواریوں پر تھیں۔ سب کے لباس چمکدار تھے۔ سب کے چہرے کھلے کھلے تھے۔ ان سے نظر ہٹا کر میں اندھیرے میں ڈوبے خالی پلاٹ کی طرف دیکھتی۔ وہاں دو سائے سر جوڑے سسکیاں لیتے محسوس ہو رہے تھے۔ پانی کے بیچ اپنے بیٹے کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں ان کے غم میں شریک ہو کر ان کے غم کو کم کر دوں مگر جانے کیوں میں ایسا نہیں کر سکی۔ ایسا سوچتے اور ارادہ

کرنے میں مجھ سے دیر ہو گئی۔

اسی اثنا میں سیٹھ امتیاز علی کے سر چڑھائے چند نمک حلال ملازم گیٹ سے باہر نکلے اور خالی پلاٹ کے سامنے آ کر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ سے ان دونوں پر روشنی ڈالی۔ روشنی میں ان کے بھیگے چہرے میں نے بھی دیکھے۔ وہ سہم سے گئے تھے۔ سیٹھ صاحب کے ایک پالتو ہرکارے نے بڑی گرجدار آواز میں انہیں مخاطب کیا۔

''اوئے سنو! رونا دھونا بند کرو اور آ کر مٹھائی لے لو۔ صاحب کے گھر امریکہ سے کتا آیا ہے۔ اس خوشی میں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے۔'' آواز اتنی اونچی اور واضح تھی کہ میں نے صاف سنی۔

''اوئے آؤ اٹھو آ کر مٹھائی لے لو'' دوسرے نے زیادہ بلند آواز میں کہا تو عورت کی رندھی ہوئی آواز آئی۔

''ہمارا بیٹا مر گیا ہے۔ ہم ......''

''او تو کہیں اور جا کے ماتم کرو یہاں نحوست کیوں ڈال رہے ہو۔ چلو شاباش اٹھاؤ اپنا کاٹھ کباڑ اور چلو۔''

''سیٹھ صاحب آ گئے تو ناراض ہوں گے۔ چلو سامان اٹھاؤ بڑے بڑے لوگ کتا دیکھنے آ رہے ہیں اور تمہارا یہاں کیا کام......؟'' تیسرے نے سفاکی سے کہا اور سب ہنستے ہوئے واپس گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے دیکھا سائے پانی میں سے چلتے ہوئے گلی میں آئے اور آگے نکل گئے۔ ننگے پاؤں مردہ بچے کو کندھے سے لگائے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میری نظریں پھر بھٹک کر ''روپ نگر'' پر ٹک گئیں کیونکہ وہاں زندگی تھی' زندگی کے ہنگامے تھے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان ملتان)



پھر سے

تیس سال کی عمر تک تو اسے یہ بالکل علم نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین اور پرکشش ہے۔ حالانکہ لڑکیاں سن بلوغت میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں۔ آئینے سے بار بار زاویے بدل بدل کر سوال کرتی ہیں۔ انجانے میں' جانے میں ایک ان دیکھا' انجانا چاہنے سراہنے والا ان کے سراپے سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔ انہیں گدگداتا رہتا ہے۔ تیس تک تو بانکپن میں بجلیاں بھر چکی ہوتی ہیں۔ اس وقت تو بس نگاہ اٹھانے کی دیر ہوتی ہے کہ صنف مخالف چاروں خانے چت۔ اس نے بھی یہ باتیں اب ہی سنی تھیں۔ پہلی مرتبہ ایاز خان نے بھرپور نگاہوں سے سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''حوریہ! تم تو نشے کی بند بوتل ہو جس کو بنا کھولے ہی نشہ چھانے لگے۔'' ایاز خان کی نشیلی نگاہوں پر اسے حیرت ہوئی۔ وہ اس کا یونیورسٹی فیلو تھا۔ بڑے عرصے بعد شاپنگ پلازہ میں اسے دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ دو بچوں کا باپ کہیں پیچھے رہ گیا۔ حوریہ نے شاپنگ پلازہ میں ہی گارمنٹس کی ایک شاپ میں داخل ہو کر قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا تو اسے سچ مچ خوریہ احمد کا پتہ مل گیا۔ اس سے پہلے تو وہ ایک کام میں مگن مقامی بنک آفیسر تھی۔

ایاز خان کی بات مستند رائے میں اگلے دن ہی بدل گئی۔ جب وہ اپنے نئے سینئر آفیسر کے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئی تو شہریار بیگ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ اس کے گڑبڑا کر پکارنے پر وہ بوکھلا سے گئے۔

''پلیز ہیو اسیٹ۔'' وہ دھیرے سے پلو سنبھال کر بیٹھ گئی۔ شہریار بیگ بظاہر تو فائل

میں جھکے تھے مگر ان کے چہرے پر پھیلا شوق نگاہ اسے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ آج اسے شہریار بیگ کی وارفتگی سے قطعاً حیرت نہیں ہو رہی تھی۔

''آپ تو اپنے نام کی ہو بہو نقل ہیں۔ آپ کو دیکھ کر کس قدر دلکشی کا احساس ہو رہا ہے۔''

وہ ہولے سے مسکرائی اور نفاست سے بال جھٹک کر بولی۔

''سر! بہت شکریہ۔''

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں میں حوریہ۔''

''سر! مجھے یقین ہے۔'' وہ بولی۔

شہریار بیگ نے غیر محسوس طریقے سے اسے دیکھا اور پھر اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

حوریہ کو دل ہی دل میں مسرت ہو رہی تھی کہ یہ چالیس بیالیس سالہ شہریار بیگ دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ یہ احساس اسے ہوا ضرور مگر اس نے اسے قریب رہنے نہیں دیا۔ اس سے اجازت لے کر وہ اٹھی اور باہر آ گئی۔ فائلوں کے انبار میں سب کچھ بھول بھال گئی۔ جب اس سے ملنے جلنے والے کلائنٹ بات کرتے کرتے اس کو بغور دیکھنے لگتے تو اس کے یقین کو تقویت ملتی۔ دل ایمان لانے لگتا کہ یقیناً وہ بہت حسین اور جاذب نظر ہے۔ اس سے پہلے اسے یہ احساس کیوں نہیں ہوا؟ یہ دانستہ اپنے سامنے بیٹھنے والوں کے تاثرات جاننے کے لئے اچانک نگاہ اٹھا کر دیکھتی تو سچ مچ حیران رہ جاتی۔

وہ بہت خود پر نازاں و فرحاں تھی کہ چلو زندگی میں ایک مرد کی بے وفائی کے بعد یہ چارم ابھی باقی ہے۔ سب کچھ برباد ہو جانے کے باوجود اگر جاذبیت و دلکشی باقی ہے تو پھر کوئی دکھ نہیں' کوئی صدمہ نہیں۔ ابھی وقت ہاتھ میں ہے۔ اس کا سر اونچا ہو گیا تھا۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ شامل ہو گئی تھی۔ مگر اس نے زیادہ بھی اترانے کی کوشش نہیں۔ کیونکہ وہ صنف مخالف کے کسی رویے کو بھی دل میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ یا شاید اچھی پرکشش شخصیت کی تعریف ہی اسے کافی تھی۔ اس سے زیادہ کی اسے نہ خواہش تھی نہ آرزو۔ مگر یہ ارادہ بہت دن قائم نہ رہ سکا۔ جب شہریار بیگ نے رات کے دس بجے اسے فون کیا تو وہ شائستگی سے سلام کر کے گفتگو کرنے لگی۔ گفتگو کے درمیان جونہی شہریار بیگ نے کہا۔

''مس حوریہ! آپ تو لب و لہجے کی بھی جادوگر ہیں۔ میں تو آپ کی شخصیت کے طلسم سے ابھی نہیں نکلا کہ یہ آپ کا انداز گفتگو تو مجھ پر سحر پھونک رہا ہے۔'' شہریار بیگ کی اس بات نے اسے چونکایا۔ وہ سنبھل کر بات کرنے لگی۔ گفتگو کا اصل مقصد جاننے کی کوشش میں اسے فوراً یہ پتہ لگ گیا کہ شہریار بیگ صرف بات برائے بات کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اتنی رات گئے بنک کا تو کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ فون بند کر کے بھی وہ دیر تک سوچتی رہی پھر سو گئی۔ مگر شہریار بیگ نے تو پھر روٹین بنالی۔ رات دس سوا دس وہ فون کر کے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی بڑی اچھی گفتگو کر لیتی تھی۔ لہٰذا بولنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں شہریار بیگ نے اپنی ذاتی زندگی کے مسائل بیان کر ڈالے۔ ان کی بیوی انتہائی جھگڑالو اور بدتہذیب خاتون ہیں۔ دو بچے ہیں۔ رات دن لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔''

یہ سب کچھ حوریہ نے شہریار بیگ کی زبانی ہی سنا۔ اس نے رسماً اظہار ہمدردی بھی کیا۔ پھر جیسے شہریار بیگ کو اس کی باتوں سے دلی سکون ملنے لگا۔ زہر آلود زندگی خوشگوار لمحوں میں بدلنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ اس قدر اس کی جادوئی باتوں کے عادی ہو گئے کہ اس کو سنے بنا رات گزارنی مشکل ہوگئی۔ اسی بے قراری میں انہوں نے اس کی زندگی کا وہ باب کھول ڈالا جسے بند کر کے وہ بمشکل پرسکون ہوئی تھی۔ ان کی ہمدردی اور محبت بھری تسلی پر کمزور لمحوں کے اثر میں اس نے بے وفا مرد کی بیوفائی کی المناک حقیقت بتا دی۔ شہریار بیگ کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ فوراً ساری دنیا سے بڑھ کر اس کے ہمدرد بن گئے۔ غمگسار بن گئے۔ ایسے اس کے قریب آ گئے کہ محبت کا دم بھرنے لگے۔ انہیں اس جیسی مہذب تہذیب یافتہ حسین ساتھی کی ضرورت تھی۔

انہوں نے پہلی بار محبت کا اظہار کیا تو وہ دنگ رہ گئی۔ وہ تو انہیں صرف اچھا ہمدرد انسان سمجھتی تھی۔ محبت کا اظہار تو اسے حیران کر گیا۔ وہ چپ چاپ ریسور تھامے کھڑی رہ گئی۔
اگلے دن جواب میں وہ ان کے کمرے میں عین سامنے بیٹھ کر صرف دھیرے سے یہ کہہ سکی۔

''محبت کی منزل کیا ہوگی سر؟'' تب انہوں نے بے تابی سے اٹھ کر پوچھا۔

''محبت کے علاوہ بھی کچھ اور ہوتا ہے کیا؟''

''ہونہہ! ایک منزل ہوتی ہے جہاں پہنچ کر آنکھیں موند کر پرسکون لمحوں کی رفاقت

میں رہا جاتا ہے۔''

''یو مین! ایک دوسرے کو اپنانا محبت کی منزل ہے۔'' انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''یقیناً ایک عورت اس معاشرے میں صرف محبت کے سہارے نہیں رہ سکتی۔''

''فی الحال میں تمہاری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ باتیں آنے والے وقت پر چھوڑ دو۔''

''میں اصرار نہیں کروں گی۔''

''میری محبت تسلیم تو کر لو کہ شاید تمہاری محبت کی طاقت مجھے جینے کا ہنر سکھا دے۔''
وہ ہولے سے مسکرائی اور محبت کو تسلیم کرنے کی سند دے دی۔ شہریار بیگ جھوم اٹھے۔ انہیں دو جہاں کی نعمتیں مل گئیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ اکثر بات کرتے کرتے اس کے سنگ زندگی کے حسین سفر پر نکل جاتے۔ خاموش محبت کی کہانی آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ حوریہ کے بنا سانس لینا محال ہوگیا۔

حوریہ تو اتنی محبت پا کر ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ شہریار بیگ نے دل و جاں سے محبت کی سچائی اور گہرائی کا یقین دلا دیا تھا۔ لیکن ایک رات بات کرتے کرتے اس نے پوچھ لیا۔

''شہریار! محبت کی فتح یابی کیلئے تم کیا کر سکتے ہو؟''

''یہ وقت بتائے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اور چپ ہوگئی۔

''میرا اعتبار کرو میں محبت کو سرخرو کروں گا۔'' انہوں نے اس کی خاموشی پر کہا تو وہ ہنس دی۔

''اچھا دیکھیں گے۔''

''آزمانا چاہتی ہو۔ حوریہ! اب تمہاری محبت میرا جیون ہے۔'' وہ جنونی انداز میں بولے۔

''یہ بھی وقت ثابت کرے گا'' اور پھر اس رات کی بات بہت جلد' چند ہی دنوں

بعد اپنے مکمل ردعمل کے ساتھ واضح ہو گئی۔

روز لمحہ لمحہ بات کرنے والے شہریار کو جانے کیا ہو گیا۔ اتوار کی چھٹی اور اس پر ستم یہ کہ فون بھی نہ کیا۔ وہ کچھ بے چین ہو گئی مگر جواب نہ ملا۔ اگلے دن بنک پہنچی تو بھی شہریار کو گم سم پایا۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی تو وہ سرسری سے انداز میں مخاطب ہوئے۔

''حوریہ! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ ورنہ قیامت آ جائے گی۔''

''وہاٹ! 'کیا' کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''حوریہ! بس کچھ نہ پوچھو چھوڑ دو ہر بات۔ ہر بات بھول جاؤ۔''

''لیکن کیوں......؟ کیا قصور ہے میرا......؟'' وہ ہکا بکا چلائی۔

''میں نے کہا نا کہ چھوڑ دو میں نے دو راتیں پل صراط پر چل کر گزاری ہیں۔ دو دن انگاروں پر چلا ہوں میں۔ میں ہار گیا ہوں...... مگر میری محبت سچی ہے۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی۔''

''سنو! ہماری محبت ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مگر ہمیں ایک دوسرے سے دور جانا ہوگا۔ خود کو آزمانا ہوگا۔''

''خدارا کچھ تو بتاؤ۔ بات کیا ہے؟''

''بات اور کیا ہو گی حوریہ! ہفتے کی رات کمزور لمحے میں بہک کر بیوی کے قریب گیا اور تمہیں پکار بیٹھا۔ اور پھر قیامت آ گئی۔ جس بات کے اظہار کا وقت نہیں آیا تھا وہ مجھے کرنا پڑا۔''

''اوہ! اب سمجھی۔'' وہ مسکرائی۔

''کیا......؟ صرف میرا اعتبار کرو میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں مگر۔''

''مگر کچھ نہیں۔ ایک شادی شدہ مرد ایسی ہی محبت کرتا ہے۔ دو کشتیوں میں سفر کرنا چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا۔ اظہار کرنے پر نادم ہو یا کسی فیصلے کی قوت بھی ہے آپ میں۔'' وہ اٹھی اور دھیرے سے تسلی بھری مسکراہٹ دیتے ہوئے بولی۔

''سنو! سنو حوریہ! یہ شادی شدہ مرد نہ نادم ہے اور نہ شکست خوردہ ہے۔ دل میں

بدگمانی کو جگہ نہ دو کہ یہ محبت کو جلا ڈالے گی۔ اس بات سے ہی میرا یقین کرو کہ میں بے خودی کے لمحوں میں بھی تمہیں پکارتا رہا۔''

''جی ہاں! ایک منافق ہی کر سکتا ہے۔ بیوی کے لمس میں محبوبہ کا احساس۔''

''طنز کر رہی ہو۔''

''طنز نہیں حقیقت ہے۔ اگر شدت محبت سے مغلوب ہو کر مجھے پکارا ہے تو پھر اس پکار کی لاج بھی رکھو۔ ثابت قدم رہ کر کوئی فیصلہ کرو۔ یہ کیا کہ دور جانے کی بات سوچ رہے ہو۔ اگر محبت میں منافقت نہیں تو پھر یہاں رہو یا دور چلے جاؤ میری محبت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''مجھے وقت درکار ہے فیصلے کیلئے۔''

''وقت نہیں ہے میرے پاس۔ نام میرا پکارا ہے آپ نے۔ بے وقعت مجھے کیا ہے آپ نے۔ یا میں ہوں یا نہیں ہوں اس کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت کرنا ہوگا۔'' وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔

''پلیز! ایسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالو میں سخت پریشان ہوں۔''

''کیوں شہریار صاحب! آپ کا گیا کیا ہے۔ میرا نام لے کر مجھے سستا کر دیا۔ کیا توقیر رہ گئی آپ کی بیوی کی نظر میں میری۔ اگر میرے نام کا بوجھ اٹھا نہیں سکتے تھے تو کیوں لیا میرا نام ایک میری ناآشنا کے سامنے۔ کھیل کھیلا ہے آپ نے کہ جیت تو ہر ممکن آپ کی ہی ہے۔''

''بات یہ نہیں ہے حوریہ! میری سوچ کے دائرے میں بدزبان بیوی نہیں میرے بچے ہیں جو میری جاہل گنوار بیوی کے جانے سے دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔''

''میں نے کب تقسیم کی بات کی ہے۔ میں نے تو تم سے تمہاری بیوی کا شجرہ نسب بھی کبھی نہیں پوچھا۔ تم مرد ہو کر ادھر ادھر کیا جھانکتے ہو وہ بیوی بچے ہیں سو ہیں پھر ان کا رونا کس بات کا۔ اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کس بات کا غم ہے؟ ہنسو مسکراؤ۔ بس منافقت اختیار نہ کرو۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔

''شاید میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ آپ کی محبت کی پیشکش پر رضامند ہونا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔''

''ایسے شکوک کیوں تمہارے دل میں آ بسے ہیں۔''

''پلیز! بات کو طول نہ دیں۔''

''مجھے وقت دو۔''

''وقت نہیں دینا۔''

''میں تمہیں شدید محبت کرتا ہوں۔ میری محبت پر شک نہ کرو۔ میری جان لے لو۔''

''کیا کروں میں اس جان کا جو لفظوں کی حرمت بھی نہیں جانتی۔''

''تمہاری زبان زہر آلود ہوگئی ہے۔''

''جی ہاں! اطلاع دینے کا شکریہ یہی زبان دو روز پہلے تک بہت شائستہ تھی۔ بہت سے پھول جھڑتے تھے میری زبان سے۔'' وہ طنز سے باز نہ رہ سکی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''دیکھیں شہریار صاحب! مشکل کیا ہے؟ آپ اپنی گھریلو زندگی بچائیں۔'' وہ یہ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔ بنک سے گھر کا راستہ اس نے خود سے سوال جواب کرتے گزارہ۔

''کیوں؟ کیوں حوریہ! تم نے شادی شدہ مرد کی محبت پر اعتبار کرلیا۔ اب بکھرنے کو تیار رہو۔ ٹوٹنے کا انتظار کرو۔''

''ہونہہ! یہ موسم کونسا پہلی بار میرے آنگن میں اترے گا۔ میں نے تو بھیگی رتوں کے بیچ تیس سال بسر کیے ہیں۔'' یہ سوچ کر ایک ٹھنڈا میٹھا موسم اسے پرسکون کر گیا۔

سکون کے اس موسم میں ٹھیک تین دن بعد شدید آندھیوں نے طوفان برپا کر دیا۔ دل و جاں پر قیامت گزر گئی۔ اعتماد اور یقین کی کرچیاں جسم و روح کو لہولہو کر گئیں۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنا محال ہوگیا۔ دل ڈول ڈول گیا۔ سماعت پر جیسے بمباری ہونے لگی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر توازن قائم کیا۔ آخری جملہ تو اس کی آنکھوں میں امڈتے سیلاب کو راستہ دکھا گیا۔

شہریار بیگم فون پہ اپنی بیوی کو کہہ رہا تھے۔ ''بس تم آ کر حوریہ پر برس پڑو بے نقط سناؤ اس طرح ہماری اس سے جان چھوٹ جائے گی۔'' حوریہ نے پلکیں صاف کیں اور اپنے آفس تک بمشکل پہنچ کر فوراً فیصلہ کیا۔ تیزی سے کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور شہریار بیگ کے پی اے کو دے کر بنک کی فضا سے باہر نکل آئی۔ سڑک پر رکشے کی تلاش میں چلتے ہوئے اس نے دیکھا قریب سے گزرنے والے اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ستائش ہی ستائش دیکھ کر وہ پوری طمانیت سے مسکرائی۔ طوفان گزر چکا تھا اور سب کچھ قائم و برقرار تھا۔ اک ان دیکھی انجانی امید پر اس نے قدم اٹھائے۔ اس کے قدموں کی مضبوطی اعلان کر رہی تھی اس بات کا کہ شہریار بیگ جیسے لوگوں سے لڑنے کی طاقت ہے اس میں۔

◈ ...... ◈ ...... ◈

ہتھیلی پہ پانی

آسمان پر بادل منہ زوری کر رہے تھے۔ تیز برفیلی ہواؤں سے جنگ کا اعلان ہو چکا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں کے ٹکراؤ سے پانی برسنے لگا۔ اس نے وحشت ناک نظروں سے بارش کے پانی کو تکتے ہوئے بے قراری سے پلٹ کر کہا۔

''دیکھو! دیکھو! شبانہ! یہ چھاجوں برستا پانی جسم کی چھلنی سے روح کو آب آب کر رہا ہے۔ پلیز آؤ دیکھو۔'' وہ دیوانہ وار بولا تو نرم گرم بستر میں گھسی شبانہ کو بستر سے نکل کر کھڑکی تک آنا پڑا۔

''امیر! کھڑکیاں بند کر دو۔ بارش بہت تیز ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے کمرہ یخ ہو گیا ہے۔''

''نہیں' نہیں' یہ بارش تو صرف مجھ پر برستی ہے۔ میرے لئے ہے۔ جاؤ' جاؤ''

شبانہ نے بے بیزاری سے لمبی سانس بھری اور ہیٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے چاہنے والے شوہر کا کیا مسئلہ ہے؟ وہ پھر شبانہ کو آوازیں دینے لگا۔

''شبانہ! شبانہ! آؤ دیکھو یہ بارش کا پانی نہیں برس رہا۔ یہ جھیل کناروں سے بہنے والا نمکین پانی ہے۔ یہ میری روح پر برستا ہے۔ اس رات سے آج تک برس رہا ہے۔ برس رہا ہے شبانہ اور میں سرتاپیر بھیگ رہا ہوں۔''

''امیر! خدا کے لئے وقت دیکھو رات کے بارہ بج رہے ہیں۔'' شبانہ نے نیند سے بوجھل جمائی لی۔

''ہاں رات کے بارہ بجے 11 جنوری کا دن شروع ہوا تھا۔ ایسی موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ ہواؤں کے شور سے کھڑکیاں کانپ رہی تھیں۔ دروازے لرزاں تھے۔ ہیٹر نہیں تھا۔ چھینٹ کی سرخ پھولوں والی رضائی میں گھس کر میں امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ یہیں اسی کمرے میں۔ اسی بستر پر۔

''امیر! آپ کو جانے گزرے ہوئے کل سے کیا لینا دینا ہے؟'' شبانہ نے تقریباً بیزاری سے کہا۔

''ہونہہ! دینے کو تو اس وقت بھی کچھ نہیں تھا میرے پاس۔'' وہ اپنی بے بسی پر ہنسا۔

''تو پھر کس بات کی پریشانی ہے آپ سو جائیں۔'' شبانہ نے اپنی دانست میں اسے حوصلہ دیا مگر وہ جھنجھلا گیا۔

''میں تین برس سے تنہا بھیگ رہا ہوں۔ میرے اندر سیلاب آیا رہتا ہے۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟''

''امیر! اگر یہ سچ سننا چاہتے ہو کہ ہر مرد کی طرح آپ کی زندگی میں بھی محبت کا کوئی حادثہ محفوظ ہے تو مجھے اس حادثے سے بھی کچھ مطلب نہیں ہے۔''

''مگر مجھے مطلب ہے۔ یہ سچ نہیں کہ کوئی محبت کا حادثہ بھی ہے۔ یہ غلط ہے۔ شبانہ! بالکل غلط ہے۔ محبت کی یوں توہین نہ کرو۔ میں تو محبت کے ہجوں سے بھی ناآشنا ہوں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ تعلیم مکمل کر کے م سے محبت کی کتاب بھی پڑھ لینا۔''

''کس نے کہا تھا؟'' شبانہ نے پہلی مرتبہ توجہ دی۔

''اس نے' بانو نے بیچ صحن میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔ سرخ سادہ سے کپڑوں میں ململ کا کناری والا دوپٹہ لپیٹے اس نے دکھ بھری بڑی بڑی پتھرائی آنکھوں سے اس کھڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ میں حیران پریشان تھا۔ جو پہلی نظر میں ہی مجھے سیندوری لگی تھی۔ لسی بلوتی' الجھے بال سنوارتی بقول میرے مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے تڑپ تڑپ کر اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ ابا کے ساتھ میں پورے دس دن گاؤں رہا اور دس دن ہی چاچا کریم کی خیریت پوچھنے جاتا رہا۔ وہ بیمار تھے مگر بانو کی جھلک دیکھنے کیلئے جاتا تھا۔ میں نے سیندوری کہہ کر بانو کو پکارا تو اسے حیرت ہوئی۔ خوب ہنسی پھر میں نے اسے یقین دلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

ابا مجھے لے آیا یونیورسٹی کھل گئی تھی۔ میں آ کر امتحان کی تیاری میں مگن ہو گیا۔ سچ مچ بانو کو بھول گیا۔ اسے دیکھ دیکھ محبت کی قسمیں دیتا تھا۔ وہ ہنستی رہتی۔ اسے یقین آیا ہی نہیں۔ میں نے اس رات یہ جانا کہ میں نے اس کا یقین توڑا ہے۔ شبانہ! میرے دیکھتے دیکھتے بارش میں بھیگتی، تھرتھر کانپتی بانو کے سر سے اماں نے دوپٹہ نوچ کر بغل میں دبا لیا۔ اور چمٹوں سے اس کی نازک سی کمر نیلوں نیل کر دی۔ مجھے اماں وحشی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بانو کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ بانو کی نظریں صرف مجھ پر جمی تھیں۔ وہ مار کھاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب امڈ آیا تھا۔ مگر میں صرف خاموش تماشائی تھا۔ میں تو کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس قدر محو تھا کہ بارش کے چھینٹے میرے کپڑوں کو بھگوتے رہے مگر مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اماں نے دہائی دی۔ سینہ کوبی کی۔ ابا نے بند کمرے سے ہی بانو کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔

تین گھنٹوں کی بیاہی بانو بے سہارا ہو گئی۔ ابا کو تو کوئی بھی سہارا دینے نہیں آیا۔ بیٹیوں ایسی بانو کو بیوی بنا لایا اور پھر اماں کی ایک للکار پر ریت کی بھربھری دیوار کی مانند گر گیا۔ اس نے زور سے کھڑکی بند کر لی۔ مجھے برا نہیں لگا۔ جانے کیوں مجھے محبت جتلانے کو کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی بہانہ نہیں تھا میرے پاس۔ یخ بستہ ایسی ہی ہواؤں میں اس کا نازک سا جسم ڈول رہا تھا۔ ابا نے فیصلہ سنا دیا۔ اماں کو انصاف کی ڈگری مل گئی۔ اور فلم کا سین مکمل ہو گیا۔

اماں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اب صحن میں صرف میرے کمرے کی کھڑکی سے روشنی جا رہی تھی۔ میرے سر کے عین اوپر سے روشنی کی کرن بانو کے دائیں بائیں پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں بھی میں اس کی خود پر جمی نظروں کا پیغام پڑھ رہا تھا۔ مگر جانے پیر کیوں جم سے گئے تھے۔ اس نے پلکوں کے اشارے سے پاس بلایا۔ مجھ میں زندگی جاگی۔ میں کمرے سے باہر نکلا۔ دروازے سے لگا کھڑا رہا۔ وہ پھر بھی مجھے ہی دیکھتی رہی۔ میں نے ایک بہانہ سوچ لیا۔ اس کو محبت کا یقین دلانے کا۔ اس کو جانا تھا اور میں جانے سے پہلے جھوٹا یقین دلانے کیلئے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے انگلی منہ پر رکھ کر کہا۔

''شش! خاموش رہو۔ مجھے یقین آ گیا۔'' میں خوش ہو گیا کہ بانو کو یقین تو آ گیا۔

''بانو! مجھے تم سے محبت ہے۔''

''مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم ملک نصیر کے بیٹے ہو۔'' میں چونکا۔

''کیا مطلب......؟''

''میرے جانے کے بعد اپنے آپ سے پوچھنا ملک امیر! اور یہ لو اسے محفوظ کر لو یہ نمکین پانی ہمیشہ تمہاری ہتھیلی پر رہے گا۔'' اپنی محبت کا ہر یقین اسے دلاتے رہنا۔ جس دن یہ اپنا احساس کھو دے گا سمجھ لینا کہ تم نے محبت کی کتاب کھول لی ہے۔''

''شبانہ! شبانہ! اس نے میری ہتھیلی پر جلتا ہوا نمکین پانی رکھ کے مٹھی بند کر دی۔ اور کھڑکی سے آنے والی روشنی سے باہر نکل گئی۔ میں گونگا بہرا ہو گیا۔ اپاہج ہو گیا۔ نہ اسے پکار سکا، نہ اسے دیکھ سکا۔ وہ جانے کہاں کھو گئی...... اور میں بند مٹھی لئے پھر کمرے میں آ گیا۔

''مٹھی کھولو امیر دکھاؤ'' شبانہ نے اپنے یخ ہاتھوں سے ایک ایک کر کے اس کی انگلیاں سیدھی کر کے مٹھی کھول لی۔ وہ حیران رہ گئی کہ اس کے خشک ہاتھ کی ہتھیلی پر گرم نمکین پانی کا چشمہ تھا۔ شبانہ کبھی امیر کو دیکھتی اور کبھی ہتھیلی کو۔

''دیکھو شبانہ! یہ وہی پانی ہے جو بانو کی آنکھ سے ٹپکا۔ یہ موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے مجھے ابھی اور تڑپنا ہے اور انتظار کرنا ہے۔ محبت کی کتاب تلاش کرنی ہے اور پھر اسے پڑھنا ہے۔ اس نے ایک بار پھر مٹھی بند کر لی اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر صحن کے بیچ بانو کو دیکھنے لگا۔ وہ آج بھی وہیں کھڑی بھیگ رہی تھی۔ بالکل اسی رات کی مانند......

نہ ابا کے کمرے کا بند دروازہ تھا اور نہ اماں کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان ملتان)

◈......◈......◈

برف کا لباس

اس نے جلتا ہوا چہرہ یخ بستہ کھڑکی کے شیشے سے لگایا تو شیشے پر جمی شبنمی ٹھنڈک قطروں کی شکل میں بہنے لگی۔ اس نے دہکتے لبوں سے ان قطروں کو چھونا چاہا۔ جلتی انگلیوں سے محسوس کرنا چاہا تو گویا سب کچھ جلنے لگا۔ باہر برف باری کا منظر دھواں دینے لگا۔ حد نظر تک آگ ہی آگ دکھائی دی۔ باہر کی ساری ٹھنڈک اس کے لئے بیکار تھی۔ کھڑکی کے شیشے پر دیوانوں کی طرح ہاتھ پھیرنے کے باوجود اس کی سلگتی روح کو قرار نہ ملا۔ بخار کی شدت سے لو دیتا جسم روح کے جہنم سے بے نیاز تھا۔ اس نے پلکیں موند کر کھڑکی سے پشت لگا لی۔ اور سامنے رکھے ٹیلی فون کو نہ دیکھنے کی خاطر ہی شاید وہ ایسا کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس فون سے ابا کی کربناک آواز نے اس کی یخ بستہ ٹھٹھری ہوئی زندگی میں آگ لگا دی تھی۔

دوسالہ پرانی قبر شق ہوگئی تھی۔ وہ زندہ ہوگئی تھی۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر خود کو محسوس کیا تھا۔ وہ دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی۔ ابا کی شفقت بھری آواز کانوں کے رستے امرت بن کر خشک مردہ سرد جسم پر برس رہی تھی۔ ابا کی آواز آج بھی اتنی ہی محبت میں بھیگی تھی جتنی اس نے زندگی کے چھبیس سال سنی تھی اور امریکہ آنے سے پہلے تو اس محبت میں ہزار گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ گلے لگا کر پیشانی چوم کر فرہاد کے ہمراہ رخصت کیا تھا۔ فرہاد نے ابا کے بازوؤں کے حصار سے اسے آزاد کرا کے اپنے پہلو سے قریب کر لیا تھا۔ اس نے ابا کے بازوؤں کی محبت بھری حفاظت بھول کر فرہاد کے پہلو میں گرم سانسیں بھرتے ہوئے پہلی مرتبہ اور آخری بار زندگی کی حرارت محسوس کی تھی۔ اس کے بعد وہ سرد خانے میں قید کر دی گئی۔ جہاں اس کے جذبات و احساسات کی حرارت نے دم توڑ دیا۔ آج ابا کی آواز نے برف کی مورت میں حرارت زندہ کر

دی۔ وہ سسک اٹھی۔

"ابا! تم نے دو سال میری خبر تک نہیں لی...... کیوں؟ کیا مجھے قبر میں اتارا تھا؟ ابا! لوگ تو قبروں پر بھی روز دیئے جلاتے ہیں۔ تم نے اپنی لاجو کو دو سال تک بھلائے رکھا۔"

"ارے نہیں میرا بچہ! میں تو تجھے رخصت کی گھڑی سے لے کر اب تک تلاش کر رہا تھا۔ تیرا پتہ ٹھکانہ پوچھ رہا تھا۔ آج ہی فرہاد کے پرانے دوست سے منت سماجت کر کے ٹیلی فون نمبر لیا ہے۔ تو ٹھیک ہے نا...... فرہاد کا دوست بتا رہا تھا کہ تو نے ملازمت کر لی ہے۔ تو وہاں بھی کالج میں پڑھاتی ہے۔"

"ہونہہ! ہاں! ہاں ملازمت ہی کر رہی ہوں ابا۔" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"اچھا یہ تو اچھی بات ہے اس طرح تیرا دل بہل جاتا ہوگا۔"

"ہاں بہت بہل جاتا ہے۔ اب بھی جانے والی تھی۔"

"لاجو! بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ تجھے ٹھنڈ ستاتی ہے۔ چائے میں کبھی کبھی جوشاندہ ڈال لیا کرو۔"

"ابا! یہاں مجھے ٹھنڈ نہیں ستاتی۔ یہ تو میری ذات کا حصہ بن گئی ہے۔"

"نہیں لاجو بیٹا! تجھ میں ٹھنڈ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ یاد ہے نا کہ تجھے روزانہ سردیوں میں ابلا ہوا انڈا کھلاتا تھا۔"

"یاد ہے ابا! ٹھنڈ کو ٹھنڈ نہیں لگتی۔ مجھ پر اب سردی کا اثر نہیں ہوتا۔" اس کے اندر سے آواز آئی۔ ابا جان نہ سکے۔ جانتے بھی کیسے؟ سادہ لوح شریف انسان کی طرح اس کی بات سمجھ لی۔

"بس مجھے فکر رہتی ہے۔ تو ہمیشہ سے اپنی طرف سے لاپروا رہنے والی ہے۔ نہ ٹھیک سے کھاتی ہے اور نہ آرام کا خیال رکھتی ہے۔ بیٹا! کام کے ساتھ آرام بھی کرتے ہیں۔ کدھر ہے فرہاد میں اسے بتاتا ہوں؟"

"ہونہہ پتہ نہیں۔"

"ہیں پتہ نہیں۔ لاج فاطمہ تجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیسی باتیں کرنے لگی ہے؟" ابا کے لہجے میں اب چاروں جانب تشویش سی پھیل گئی۔ اس نے لہجہ بدلا۔

"ابا! دراصل فرہاد دو تین روز سے ٹور پر ہیں۔"

''اچھا جب آئے تو میری طرف سے دعا دینا اور بس اپنا خیال رکھنا۔''

''ابا! آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟''

''بس بیٹا! ٹھیک ہے اب تو دوائیوں کے سہارے چل رہے ہیں۔''

''ابا! اپنا خیال رکھا کرو۔ مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔''

''بس تو اپنا خیال رکھنا تیری خوشیوں کے ساتھ میری سانسیں بندھی ہیں۔'' ابا کی بات اس کے دل کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ فون بند ہوتے ہی وہ سسک اٹھی۔ آنکھوں سے سیلاب امڈ آیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روئی اپنائیت اور محبت کی ڈور کٹ گئی۔ اس کا وجود ہچکیوں کی زد میں آ گیا۔ اس کے پیارے ابا کی آواز دور رہ گئی۔

''ابا! ابا! مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میں یہاں سے آنا چاہتی ہوں۔'' وہ سسکیوں کے بیچ چلائی۔ ابا! تمہاری لاج فاطمہ یہاں قبر میں دفن ہے اسے نکالو۔ یہاں سے نکالو۔ اس کی چیختی سسکیوں میں ایک دم فرہاد کی کرخت آواز نے رکاوٹ پیدا کی۔ وہ سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ وہ قریب آیا۔ اس کی تھوڑی انگلی سے اوپر کی طرف اٹھائی۔ جھٹکے سے اس کی گردن موڑ کر ہونٹ رکھے اور جنون کی حدوں کو چھولیا۔ وہ پوری طرح اس کے بس میں تھی۔ وہ کھینچتا ہوا صوفے پر لے گیا اور بلاؤز کو نوچ کر بدن کی نرمیوں کو جھنجھوڑتے ہوئے ذرا دیر کو رکا اور اس کی آنکھوں میں بے بسی کی پھیلی نفرت دیکھ کر اس پر سے اٹھا۔ اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر پورا مزہ لیا۔ پھر سفاکی سے مسکرایا۔

''لگتا ہے تم غیروں کے مزے کی عادی ہو گئی ہو۔''

''اپنا تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' بلاؤز پہنتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''ویسے یار! تم ہو بڑی چسکیلی گورے اسی لئے تم پر دولت لٹاتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر ایسے انداز میں بولا جیسے کوئی کھٹی میٹھی گولی کھانے کے بعد مزہ محسوس کرے۔

''آج کس گورے سے دولت لائے ہو؟'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

''مسٹر ڈیوڈ کا ڈرائیور باہر آ چکا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔'' وہ بولا تو وہ ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھو کر دیکھا۔ اپنی گردن چھو کر دیکھی اور چلا اٹھی۔

''دیکھتے نہیں کہ میں تیار ہوں۔ دیکھو چھو کر دیکھو مجھے۔ میں پھر سے برف بن گئی

ہوں۔ میرے وجود کی حرارت پھر ختم ہو گئی ہے۔ میں نے برف کا لباس پہن لیا ہے۔ آج بہت عرصے بعد کچھ دیر کو لباس بدلا تھا۔ جی کر دیکھا تھا۔ اب میں تیار ہوں۔'' وہ جھٹکے سے آگے بڑھی۔ پرس اٹھایا اور باہر کے دروازے کا رخ کیا۔ جاتے جاتے نگاہ ٹیلی فون پر ٹک گئی...... ابا کی آواز آنے لگی۔

''لاجو! لاجو! بیٹا! کھانا کھالو چائے پی لو گرم کپڑے پہن لو۔'' اس نے بھیگی پلکیں رگڑ کر صاف کیں اور باہر نکل گئی۔ دور تک ابا کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔

''لاجو! لاجو بیٹا! باہر ٹھنڈ ہے۔ اپنا خیال رکھنا...... خود کو ٹھنڈ سے بچانا۔''

اس نے سیاہ چمکیلی گاڑی میں بیٹھ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ جیسے وہ سچ مچ ابا کی محبت بھری آواز سن رہی ہو اور اسے سننا نہ چاہتی ہو۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان ملتان)

◈ ...... ◈ ...... ◈

بانو اور ببلی

سلائی مشین چلاتے ہوئے اسے مسلسل تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ جوں ہی ذرا دیر کو پہیہ رکا اماں نے کھانسی حلق میں دباتے ہوئے اسے پکارا۔

"بس کر بانو اور کتنا لوہے کے پرزوں سے لڑے گی۔ تھک جائے گی تو۔ یہ تو تیرا خون پی کر چلتے رہیں گے۔"

بانو نے تھکی تھکی نیند سے بوجھل آنکھوں سے سچ مچ مشین کے کل پرزے دیکھنے شروع کر دیے۔ جیسے وہ واقعی اس کا خون پی رہے ہوں۔ اسی لیے ہاتھوں کی رگیں ستلی کی مانند موٹی ہو کر ابھر آئی تھیں۔

اسے اپنے سفید نرم و نازک گداز ہاتھ یاد آ گئے جن پر شادی کی رات ولی محمد نے قربان ہوتے ہوئے سلگتے ہونٹ رکھ کر وارفتگی کا ثبوت دیا تھا۔ کئی مہینے وہ ہاتھوں پر ولی محمد کے ہونٹوں کی گرمی محسوس کرتی رہی تھی۔ ایک روز ولی کو بتایا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔

"اچھا تو یہ میرے ہونٹوں کی گرمی کا اثر ہے جو تو اتنا مزے دار کھانا پکاتی ہے۔" یہ سن کر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تب ولی محمد اس کی معصوم ادا پر جھوم اٹھا۔

"بانو! بانو! ببلی رو رہی ہے آوازیں دے رہی ہے۔ تو کہاں کھو گئی؟" اماں نے اس کے حسین خیالات کا سلسلہ توڑ ڈالا۔ وہ چونک کر کمرے کی طرف بھاگی۔ ببلی سچ مچ جاگ کر رو رہی تھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ اسے دوا دے کر سلا کر گئی تھی۔ کھوکھر صاحب کی چھوٹی بیٹی کا سکول یونیفارم ہر صورت صبح سویرے سی کر پہنچانا تھا۔ اب رات کے دو بجے تھے مگر کام باقی تھا۔ وہ ببلی کو سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

"کیا ہوا میری گڑیا کو؟ ڈر گئی تھی؟ ہے نا۔"

"امی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے پاس لیٹو۔" ببلی نے اس کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی تو بہت بہادر ہے۔ چھ سال کی نہیں سولہ سال کی ہے۔ ڈرتے تو چھوٹے بچے ہیں۔" اس نے اس کے گرم گرم چہرے پر پیار کرتے ہوئے کہا تو ببلی نے دھیرے سے کہا۔

"امی! میں سولہ سال کی تو نہیں ہوں۔"

"ارے! ایسے نہیں کہتے۔ اللہ تمہیں میری عمر بھی لگا دے۔ تم اپنے ابو کا خواب پورا کرو گی۔ وہ کہتے تھے میری ببلی کو ڈاکٹر بنانا ہے۔"

"میں تو بیمار رہتی ہوں۔ پڑھنے بھی نہیں جاتی۔ آمنہ تو سکول جاتی ہے۔" ببلی کو سفید کوٹھی والے ٹھیکیدار صاحب کی آمنہ یاد آ گئی۔

"ہاں تو کیا ہوا۔ تم بھی جایا کرو گی۔ صرف پانچ مہینے کا علاج باقی ہے۔ بس پھر میں اپنی ببلی کو سکول میں داخل کرا دوں گی۔" بانو نے اپنے اندر کا دکھ اور خوف پسلیوں کے نیچے چھپاتے ہوئے بیٹی کو امید کی کرن دکھائی۔

"پیسے کہاں سے آئیں گے؟" ببلی نے ایک دم معصومیت سے پوچھا۔

"میں کپڑے سیتی ہوں۔ اتنے پیسے کما لیتی ہوں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بے ترتیب سے جملے بول گئی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔" ببلی نے کہا تو وہ پریشان ہو گئی۔

"اس وقت تو کچھ نہیں کھانے کو' صبح ناشتہ کرنا اب سو جاؤ۔" مگر ببلی نے پھر کہا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے امی۔"

"کہا نا سو جاؤ۔ آؤ دادی کے ساتھ لٹاتی ہوں۔" اس نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر برآمدے میں اماں کے ساتھ اسے لٹا دیا۔

"اماں! اسے ڈر لگ رہا ہے تم سلا لو۔ میں کپڑے تیار کر کے اٹھا لوں گی۔"

"اچھا لیکن اب تم بھی سو جاؤ۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"اماں! اگر قسمت اچھی ہوتی تو ولی محمد اچانک ہمیں بے یار و مددگار نہ چھوڑ گیا ہوتا۔" اس کا گلا رندھ سا گیا۔

"ہونی پر کس کا زور چلتا ہے۔ وہ کون سا اپنی مرضی سے گیا ہے۔ اللہ سمجھے ان بگڑے ہوئے نوجوانوں کو جنہوں نے نشے میں دھت ہو کر میرے جگر کے ٹکڑے پر گاڑی چڑھا دی۔" اماں کی بوڑھی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ بانو کی پلکوں سے بھی ساون برسنے لگا۔

"دادی! مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" وہ دونوں ولی محمد کی حادثاتی موت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ بلی نے اچانک کہا تو بانو نے جلدی سے کہا۔

"بیٹے یہ سونے کا وقت ہے۔ چپ کر کے سو جاؤ۔"

"ارے بچی کو بھوک لگی ہے اسے کھانے کو دو۔" اماں نے بوسیدہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بہو سے کہا۔

"اماں! اس وقت تو کچھ نہیں ہے۔ اچھا یہ گجک پڑی ہے۔ لو یہ کھا لو۔" بانو نے ایک دم ہی سلائی مشین کے پاس رکھے ریلوں، بٹنوں کے ڈبے سے کاغذ کی پڑیا نکال کر بلی کو دی۔ اسے واقعی شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ لیٹی لیٹی چپ چاپ منہ چلانے لگی۔

"کیا کھانا ختم ہو گیا؟" اماں نے انتہائی تعجب سے بانو کو دیکھا اور پوچھا۔

"اماں! آپ دونوں اب سو جاؤ میں بھی جلدی سے کام ختم کر لوں۔" وہ ان کی بات یکسر ٹال کر مشین چلانے لگی۔ مگر کچھ دیر ہی سکون سے کام کر پائی تھی کہ بلی کو شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اماں نے سارا غصہ بانو پر نکالا۔

"بچی کو کھانا دینے کے بجائے یہ اللہ ماری گجک دے دی۔ میٹھے سے کھانسی اٹھی ہے اتنا سارا کھانا کھا گئے کیا؟"

اماں بولتی رہیں۔ وہ چپ چاپ بلی کو سینے سے لگائے کمرے میں لے آئی۔ رات کا باقی حصہ وہ اس کا سر گود میں رکھے سلانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر کھانسی نے نہ بلی کو سکون لینے دیا اور نہ اسے۔ باہر اماں بھی بے چین رہیں۔

درد کی رات آنکھوں میں گزر گئی۔ بلی رات بھر بے آرام رہنے کے بعد سو گئی۔ بانو کی بانہوں میں کھانستے کھانستے اس نے رات بتائی تھی۔ گجک زہر بن گئی تھی۔ بانو دل ہی دل میں خود کو کوستی رہی۔ قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔ جوں ہی صحن میں چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آئیں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یونیفارم میں کچھ کام باقی تھا۔ وہ ہر صورت

سات بجے سے پہلے پہنچانا تھا۔ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار کے مشین چلائی تو جائے نماز پر بیٹھیں اماں نے تسبیح ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"مشین کی کھڑ کھڑ سے بلی جاگ جائے گی۔ رات بھر کی جاگی بچی کو سونے دو۔"

"اماں! یہ مشین بھی تو اسی کے لیے چلا رہی ہوں۔ پیسے لے کر دودھ اور ڈبل روٹی لے کر آؤں گی۔" اس نے تیز تیز مشین چلاتے ہوئے بتایا۔ تب اماں نے ذرا حیرت سے بانو کو دیکھا اور اس کے بالکل قریب آ کر بولیں۔

"رات ہی تو ماسٹر صاحب کا بیٹا سو روپے دے کر گیا تھا۔ یہ لو اس میں سے لے آؤ جو کچھ لانا ہے۔"

"نہیں! وہ بس میں لے آؤں گی یہ آپ اپنے پاس رکھیں۔" وہ بولی اور مشین کا کام ختم کر کے جلدی جلدی سوئی میں دھاگہ ڈال کر قمیص پر بٹن لگانے لگی۔ اماں بوڑھی کمزور آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں جس پر مستقل غموں اور اداسیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بھری جوانی میں بیوگی کا لباس پہن کر تمام امنگوں، آرزوؤں کو کسی پرانی قبر میں اتار کے وہ سرتاپیر تنہا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی اور حرارت موجود تھی اور آنکھوں کی پتلیوں میں بلی کا بسیرا تھا۔ اماں کو اس کی اداس، بے رنگ زندگی کا دکھ چاٹ رہا تھا مگر کچھ بھی تو ان کے اختیار میں نہیں تھا۔

ان کا بس چلتا تو وہ موت کے فرشتے کو اپنی جان دے کر بیٹے کی زندگی واپس لے لیتیں۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکیں۔ زندگی میں بچا ہی کیا تھا۔ بیوہ بہو اور بیمار پوتی کہ جسے ٹی بی جیسی بیماری سے جنگ لڑنے کے لیے دوائیں، اچھی غذا اور ڈھیر سارے آرام کی ضرورت تھی۔ مگر بانو کے لیے سب کچھ فراہم کرنا ناممکن تھا۔ محنت مشقت کے بعد جو پیسے ملتے اس سے کبھی مہنگی دوائیں آ جاتیں تو کبھی کوئی پھل۔ اکثر و بیشتر تو دونوں چیزوں میں سے کچھ بھی میسر نہ آتا۔ رات دن مشین چلا چلا کر جب سو ڈیڑھ سو روپے ہاتھ میں آتے وہ تشکر بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتی۔ ایسے میں اماں افسردہ ہو کر کہتیں۔

"کیا بنتا ہے اس سو ڈیڑھ سو سے۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔"

"کیا کریں اماں اللہ جس حال میں رکھے۔ یہ سو ڈیڑھ سو بھی اب بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ امیر لوگوں کو ریڈی میڈ کپڑے اچھے لگتے ہیں یا پھر درزیوں سے سلواتے ہیں۔ گھر

کے معمولی سے کپڑے بھی مہنگے درزی سیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے کپڑے لینے میں کامیاب ہوتی ہوں۔'' وہ دھیرے سے اماں کو دلاسے کے انداز میں سمجھاتی۔

''کاش! ولی محمد کوئی چھوٹا موٹا کلرک ہی ہوتا کچھ تو پیسے تمہیں ملتے رہتے۔'' اماں کا اشارہ پنشن کی طرف ہوتا۔ تب وہ دکھ سے مسکرا دیتی۔ وہ معصوم سی اماں کو کیسے سمجھاتی کہ ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر میں پیدا ہونے والا ولی محمد مزدور سے زیادہ کچھ نہیں بن سکتا تھا۔

اس وقت بھی جوں ہی سلا ہوا یونیفارم تہہ کر کے اس نے باہر نکلنے سے پہلے چادر اٹھائی تو اماں نے تاسف سے لمبا سانس بھرا۔ شانوں پر چادر پھیلا کر وہ ان کے قریب آئی۔ ان کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ رکھ کے دھیرے سے بولی۔

''آپ صرف دعا کریں کہ ہماری بیلی ٹھیک ہو جائے۔ ہم اسے ڈاکٹر بنائیں۔ ولی محمد کی خوشی پوری کریں۔''

''انشاء اللہ مگر......''

''کچھ نہیں اماں! سفر میں تھکن محسوس کروں گی تو ایک قدم بھی نہیں اٹھا پاؤں گی۔ مجھے بیلی کو تھکن نہیں دینی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور یونیفارم اٹھا کر صحن عبور کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کی ممتا اس کا ارادہ بن کر اس کے کمزور مریل سے وجود سے لپٹی ہوئی اماں نے صاف دیکھی اور پھر صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ کر دعا کرنے لگیں۔

مگر ان کی دعاؤں' بانو کی جان مار محنت کے باوجود بیلی کی طبیعت سنبھلنے کے عمل سے عاری تھی۔ کھانسی اور بخار مستقل رہنے لگا تھا۔ دوائیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ سخت پریشان تھی۔ تین چار روز کی کڑی مشقت کے باوجود سلائی کا ایک جوڑا حاصل نہ کر سکی تھی۔ اپنے محلے' سامنے والی کالونی کا ہر گھر جھانکنے کے بعد بھی کام نہ ملا تو اس نے بڑی ہمت کر کے کریانہ سٹور سے بیلی کے لیے رس اور دودھ کا پیکٹ پہلی مرتبہ ادھار مانگا۔ سٹور کے مالک منو چاچا نے پہلے تو گومگو کی کیفیت میں پرانی سی چادر میں لپٹی بانو کو سر سے پیر تک دیکھا پھر ایک دم ہی ترحم بھری آواز میں کہا۔

''سودا تو آپ لے لو۔ پر میری گھر والی نے نکے پر سے وار کے یہ گوشت دیا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس غریب کو دوں؟ اب آپ سے زیادہ غریب اور مستحق کون ہو گا؟''

منو چاچا نے اپنی نگاہوں کی کٹھالی سے پرکھ کے اسے مستحق اور غریب قرار دے دیا تھا۔

''جی نہیں! مجھے یہ گوشت نہیں چاہیے۔'' چادر کا پلو آدھے چہرے پر کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ منو چاچا نے شان بے نیازی سے کندھے اچکائے اور گوشت کا شاپر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''شاوا بھئی! ہڈی سے چھڑا لگ گیا ہے پھر بھی گوشت نہیں لینا۔''

''دراصل میری بیٹی کو ڈاکٹر نے گوشت منع کیا ہے۔ گھر میں پکے گا تو وہ ضد کرے گی۔'' کسی ملزم کی طرح اس نے منو چاچا کو کوتوال سمجھ کر صفائی دی۔ تب منو چاچا نے ایک پرچی پر رس اور دودھ کے پیکٹ کے پیسے لکھ کر سامان سمیت اسے تھما دیئے۔ ندامت سے پیر اٹھا کر اس نے گھر کا رخ کیا۔

ادھار کے بوجھ سے پتھر جیسے قدم جوں ہی گھر کی دہلیز سے اندر رکھے تو صحن میں ہی بیلی دیکھ کر مسکرائی۔ بیلی اسے دیکھ کر کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھی اور چلائی۔

''امی! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ابھی! بس ابھی میں اپنی بیٹی کو دودھ اور رس دیتی ہوں۔''

خوش اور مطمئن نظر آنے کی بھرپور اداکاری کرتی ہوئی وہ سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی۔ دودھ کا پیکٹ کاٹ کر کپ میں دودھ انڈیلتے ہوئے اسے منو چاچا کے جملے یاد آنے لگے۔ غم سے آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔ آج کتنی شرمندگی سے گزرنا پڑا تھا۔ چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کر کے باورچی خانے سے باہر نکلی تو بیلی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے دودھ کا کپ اور رس کی پلیٹ ایک طرف رکھی اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ بیلی کو اس وقت بھی بخار تھا۔ وہ پریشان ہو کر کبھی پیشانی' کبھی کلائی چھو کر دیکھنے لگی۔

''اماں! بیلی کو تو اس وقت بخار ہے۔''

''ہاں صبح سے ہے۔ بار بار کھانسی بھی اٹھتی ہے۔ دوائیں وقت بے وقت دیتی ہو شاید اس لیے فرق نہیں پڑ رہا۔'' اماں تسبیح پکڑے پکڑے ان دونوں کے پاس آ کر فکرمندی سے بولیں۔

''کیا کروں؟ مہنگی دوائیں خریدنے کے لیے پیسے کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔''

بانو کا جواب سن کر اماں نے سیاہ سلیپروں پر جمی گرد اور پیروں کی تھکن سے بہت کچھ اندازہ کر لیا اور دل گرفتگی سے بولیں۔

''بانو! سلائی کا کام نہیں ملا کیا؟''

''نہیں اماں! اب سب کپڑے درزیوں سے سلوائے جاتے ہیں۔ سوچ رہی ہوں گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام ہی کرنے لگوں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' اماں کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

''تو کیا کروں؟ آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ بلی کی صحت خراب سے خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پیسوں کے بغیر دوائیں بھی نہیں آ سکتیں۔ یہ دودھ اور رس ادھار لائی ہوں۔'' بانو نے نہایت رنجیدہ لہجے میں کہا اور بلی کو کھلانے کے لیے سہارا دے کر بٹھانے لگی۔

''بلی کو ہسپتال میں نہ داخل کرا دیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ اب تو ہسپتالوں میں بھی سب کچھ پیسوں سے ملتا ہے اور پھر کیسے سنبھالیں گے؟ کون بلی کے پاس رہے گا؟ میں کام کاج دیکھوں گی یا ہسپتال میں رہوں گی؟''

''میں ہسپتال میں رہ لوں گی۔''

''نہیں اماں! یہ بہت مشکل ہے اور پھر میں اتنی دور کتنے چکر لگاؤں گی؟'' بانو نے سمجھایا تو بلی نے غنودگی سے اجازت مانگ کر ماں کا حوصلہ بڑھایا۔

''امی! میں گھر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' بانو نے بے قرار ہو کر پیار سے اس کو سینے سے لگا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ بلی دوبارہ غنودگی میں ڈوب گئی۔ بانو نے برتن ایک طرف رکھ دیئے۔ اس کا سر گود میں رکھ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ بخار کی وجہ سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ حالانکہ بھوک لگنے کا خود کہا تھا۔ اماں اٹھ کر اپنے تخت پر جا بیٹھیں۔ بانو کا ذہن بھٹکنے لگا۔ بلی کو دواؤں کی اشد ضرورت تھی۔ سوال یہ تھا کہ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ درد سے دکھتی ٹانگیں پھیلا کر وہ کافی دیر یہی سوچتی رہی۔ بلی کے پپڑی زدہ ہونٹوں کی جھری سے گرم گرم سانسیں اس کی پسلیوں کو چھو رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں کھانسی کا دورہ سا پڑتا تو بانو کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ورنہ پھر بے کل سی سوچ میں ڈوب جاتی۔ مگر اب کی بار اس کی سوچ کا سلسلہ دروازہ بجنے پر ٹوٹا۔ کوئی مستقل دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی اماں دروازے پر پہنچ گئیں۔ بانو ویران آنکھوں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی کہ کچھ دیر بعد اماں ایک بڑا سا شاپر بیگ کپڑوں سے بھرا

لے کر آئیں تو وہ خوشی سے اٹھ بیٹھی۔ مگر اماں نے اس کی خوش فہمی دور کر دی۔

''یہ آمنہ کے پرانے کپڑے ہیں بلی کے لیے ملازمہ دے گئی ہے۔'' بانو کو جیسے زہریلے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ غم و غصے کی پرچھائیاں پھیلی اماں نے واضح محسوس کیں۔

''آپ نے کیوں لیے؟ میری بلی کب اترن پہنتی ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''ارے جس دوارہے پر ہم کھڑے ہیں وہاں کوئی اترن بھی دے دے تو اس کی مہربانی ہے۔'' اماں نے تاسف سے مگر تیزی کے ساتھ کہا۔ بانو کو پھر بھی یہ بات اچھی نہ لگی اس نے کپڑوں کا شاپر دودھ پھینکا۔

''کچھ بھی ہو میں نے اپنی محنت کی کمائی سے اپنی بیٹی کو کھلایا اور پہنایا ہے۔ میری بلی یتیم ہے، مسکین نہیں۔ آپ کو یہ کپڑے واپس کر دینے چاہئیں تھے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ نے یہ اترن لے لیے۔''

''وقت ایک سا نہیں رہتا۔ نہیں پہنانے تو ایک طرف ڈال دو مگر میں نے مجبوری کا راستہ بند نہیں کیا۔ جانے کب کیسی ضرورت آ پڑے آ جائے؟'' اماں نے افسردہ سی سنجیدگی سے کہا اور مغرب کی نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئیں۔ بانو پر ان کی باتوں کا وزنی پتھر گر گیا پھر وہ کچھ بولی نہیں۔ اٹھی اور کپڑوں کا شاپر اٹھا کر برآمدے میں پڑے لوہے کے ڈرم کی طرف بڑھی اور ڈرم میں ڈال دیا۔ پھر چپ چاپ خود بھی وضو کے لیے چل دی۔ وضو کے بعد جائے نماز پر قدم رکھتے ہی صدمے سے چور چور دل گویا آنسوؤں کے رستے بہہ نکلا۔ اس نے اللہ کے حضور دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ نماز پڑھ کر کافی اطمینان محسوس ہوا۔ مغرب کے فوراً بعد اماں کھانا کھاتی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی مگر سوائے ایک آلو کے پکانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ پریشانی سے اس کا دل پھر بیٹھنے لگا۔ تب اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی پریشانی اللہ نے جان لی تھی۔ ہمسائے کے گھر سے ٹرے میں کھانا کسی نے دروازے کی اوٹ سے پکڑایا تو اس نے لرزے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی۔

''برتن خالی کر دیں۔'' کھانا لانے والے نے کہا تو وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف آ گئی۔ جلدی جلدی برتن خالی کیے۔ دروازے پر منتظر آدمی کو برتن پکڑا کے سیدھی پھر باورچی خانے میں آ گئی۔ سارا کھانا لیے اماں کے پاس ان کے تخت پر آ بیٹھی۔

''اماں! یہ کھانا کھالو۔''

''اسی لیے راستہ کھلا رکھا تھا میں نے۔'' اماں نے اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر دھیمے سے کہا تو وہ تمام تر کرب چھپا کر ہلکا سا مسکرا دی۔ انہیں کیسے بتاتی کہ یہ نوالے کس تکلیف کے ساتھ حلق سے اترتے ہیں؟ کس کس طرح سے خودداری کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ یہ...... یہ سب وہ اماں کو بتانا چاہتی تھی حالانکہ وہ تو خود ہر لقمے کے ساتھ بے بسی و بے چارگی کا کڑوا گھونٹ پہلے بھرتی تھیں مگر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ زندہ آدمی کے لیے سب سے ضروری پیٹ کی آگ بجھانا ہے اور اس آگ کو بجھانے کے لیے انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔ اماں جانتی تھیں کہ پیٹ کے لیے روٹی چاہیے۔ روٹی کے لیے یہ خیال ہی کافی تھا کہ کہیں سے بھی آئے بس آنی چاہئے۔ بانو کے پاس سلائی کے پیسے ہوتے تو وہ دال دلیہ گھر میں پکا لیتی۔ لیکن کسی کسی دن ایک پیسہ بھی پاس نہیں ہوتا تھا تو اللہ کی آس پر بیٹھ جاتی۔ جیسا آج کا دن تھا۔ بیٹی کے لیے تو ادھار مانگ لائی تھی مگر اماں کے لیے اپنے لیے سخت پریشان تھی۔ اللہ نے بندوبست کر دیا تھا۔ بظاہر اس وقت دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں مگر نظریں چرا رہی تھیں۔

اگلے روز اس تسلی کا بھرم رکھنے کے لیے صبح سویرے ہی چائے کی پیالی پی کر بانو اپنی گلی سے نکل کر سڑک کے دوسری طرف نئی کالونی میں کام کاج کے لیے جا پہنچی۔ تین چار عالی شان کوٹھیوں میں بسنے والی بیگمات کی منت سماجت کے بعد ایک بیگم صاحبہ کو اس پر رحم آ گیا۔ اسے کپڑے دھونے کا کام مل گیا۔ پانچ سو روپے مہینے بھر کپڑے دھونے تھے۔ اس نے غنیمت سمجھا اور کپڑے دھونے میں مصروف ہوگئی۔ مسلسل دو گھنٹے کپڑے دھونے کے بعد وہ آنے لگی تو بیگم صاحبہ نے اسے کھانا دیا جو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھر لے آئی کیوں کہ گھر میں اماں نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی اسے بلی کے کھانے کی فکر لاحق ہو گئی۔ آج تو اس کے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی دوائیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ وہ پریشان سی صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ تب اماں نے اس کے قریب آ کر حیرت سے کہا۔

''بانو! کیا بات ہے کیا ہوا؟'' تیرے سارے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟''

''ہاں! وہ کپڑے دھونے کی وجہ سے گیلے ہوگئے ہیں۔ ابھی بدلتی ہوں۔ یہ لیں آپ کھانا کھالیں۔ یہیں تخت پر بیٹھ جائیں۔'' اس نے چادر کے پلو سے دایاں ہاتھ باہر نکالا

اور کھانا تخت پر رکھ دیا۔ دراصل وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلی کے کان میں اس کھانے کی بھنک بھی پڑے۔ مگر بلی کو اس کے آنے کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ اندر کمرے سے ہی چلائی۔

''امی! امی! مجھے بھی کھانا دو۔ بھوک لگی ہے۔''

''ہاں ہاں! کھانا لاتی ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور اماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو بانو؟''

''وہ اماں! بلی کھانا۔ کیا؟'' وہ سخت اضطرابی کیفیت سے دوچار ہو کر بولی۔

''یہ کھانا دے دو اسے۔ کب تک خود کو اور اسے آزماؤ گی۔'' اماں اس کی پریشانی بھانپ کر بولیں۔

''میں نے اب تک بلی کو ایسا کھانا نہیں کھلایا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''جب ایسا کھانا اس کی قسمت میں لکھا ہے تو کیوں مشکل میں گرفتار ہوتی ہو؟''

''اس کی دوائیں پوری ہونی مشکل ہو رہی ہیں۔'' اماں نے کھانا اٹھا کر بلی کے کمرے کا رخ کیا۔ مگر وہ ان کے سامنے آ گئی۔

''نہیں اماں! ابھی مجھے کوشش کرنے دو۔ میں دوائیں اور کچھ کھانے کے لیے لے کر آتی ہوں۔ یہ سلائی مشین آخر کس دن کام آئے گی؟'' وہ بولی۔

''سنو! اس مشین کی دراز میں تین سو روپے رکھے ہیں وہ لے لو۔'' اماں نے کہا تو وہ غیر یقینی انداز میں بولی۔

''تین سو روپے کہاں سے آئے؟''

''اطمینان رکھو بلی کے باپ کی محنت مزدوری کی کمائی ہے۔'' اماں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا اور دوبارہ کھانا لے کر تخت پر بیٹھ گئیں۔ بانو کی نظریں ولی محمد کی تلاش میں سارے صحن میں بھٹکنے لگیں اور پھر بڑے سے صندوق پر آ کر ٹھہر گئیں۔

''اماں! آپ نے ولی محمد کا سامان بیچ دیا۔ وہ مزدوری کا سامان جو آپ نے سینے سے لگائے رکھا تھا۔'' بانو حیرت واستعجاب کی کیفیت سے دوچار تھی۔

''ہاں مگر اپنے لیے نہیں۔ اس کی نشانی کے لیے بیچا ہے۔'' اماں کا گلا رندھ گیا۔

''اماں! میں شرمندہ ہوں۔ ہماری وجہ سے آپ کو یہ دکھ پہنچا۔'' بانو شدت جذبات

سے ان کے سینے سے لگ گئی۔

''ہماری بلی ٹھیک ہو جائے بس یہ ہی سب سے بڑی خوشی ہے۔تم جا کر دوائیں لے آؤ۔'' اماں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں بلی کی کھانسی کی آواز آئی تو وہ بجلی کی سی پھرتی سے مشین کی دراز سے پیسے لے کر باہر چلی گئی۔

پھر کئی روز گزر گئے۔ بانو کو ہلکا سا اطمینان تھا کہ بلی کی ہفتے بھر کی دوائیں خرید لی ہیں۔اس کے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا تھا۔مگر بلی کی طبیعت سنبھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اب تو کھانسی کے بعد بلغم میں خون بھی شامل ہو کر نکلنے لگا تھا۔ بانو یہ دیکھ کر سخت پریشان ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اماں سے تو ذکر نہ کیا مگر جب کپڑے دھونے کے لیے کوٹھی گئی تو بیگم صاحبہ نے اس کو پریشان الجھا الجھا دیکھ کر خود پوچھا۔

''بانو! کیا کوئی پریشانی ہے؟''

تب اس کی ویران سی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے ممتا بھرا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی درد بھری داستان سن کر بڑی بیگم نے اتنا کیا کہ تنخواہ کے آدھے پیسے اس کی مٹھی میں تھما دیئے اور ڈھیرے سارے دلاسے دے کر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ اس ہمدردی پر بھی تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کر کے گھر واپس آ گئی۔

''بانو! بانو! بلی تو خون تھوک رہی ہے۔ یہ کیسی دوائیں ہیں جو ذرا سا فرق نہیں پڑ رہا؟'' اماں نے تشویش سے اسے بلی کے بارے میں بتایا۔

''اماں! ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ٹی بی کی دوائیں باقاعدگی سے دینی ہوتی ہیں۔ ایک دن کا ناغہ بھی مہینوں پیچھے لے جاتا ہے اور ہم تو کئی کئی دن دواؤں کا ناغہ کرتے ہیں۔'' وہ چادر اتار کر اماں کے بستر پر لیٹی بلی پر جھک گئی۔ وہ نڈھال پڑی تھی۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ پپڑی زدہ ہونٹوں پر بالکل چپ لگی تھی۔ آج اس نے ماں کو دیکھ کر بھوک لگی ہے کا نعرہ بھی بلند نہیں کیا تھا۔ بانو صدمے سے رو دی۔ اس کی پلکوں سے ٹوٹتے گرم قطرے بلی کے چہرے پر گرے تو اس نے نقاہت اور غنودگی کے باوجود ہولے سے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''امی! مجھے بھوک نہیں لگی۔'' بانو کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اسے سینے سے لگا کر چومنے لگی۔

''میری زندگی! میری بیٹی! اتنا اچھا کھانا بنا کر دوں گی کہ میری گڑیا کو بہت اچھا

لگے گا۔''

''بس تم اسے کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں لے کر جاتی ہوں۔'' اس نے پلو میں بندھے اڑھائی سو روپوں کو دیکھا اور ہمت پکڑی۔

''اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔'' اماں نے تاکید کی۔

وہ اثبات میں گردن ہلا کر بلی کو تیار کرنے لگی۔ اس کے بالوں میں کنگھی کر کے پیروں میں جوتی پہنائی تو وہ لڑکھڑا گئی۔ اس میں اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ بانو نے جلدی سے چادر اوڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

اماں کا خدشہ سچ نکلا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی تشویش ناک لہجے میں بیماری کے آخری سٹیج میں داخل ہونے کا خدشہ ظاہر کیا۔ ساتھ بانو کو سختی سے برا بھلا بھی کہا کہ مرض میں اضافہ جہالت اور غفلت کے باعث کیا ہے۔ بانو کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو چاہتے ہوئے بھی یہ نہ کہہ سکی کہ جہالت اور غفلت سے نہیں غربت سے بیماری میں اضافہ ہوا ہے۔

''میں جاہل نہیں ہوں۔ میں غافل نہیں ہوں۔ میں تو مجبور تھی۔'' مگر یہ سب باتیں وہ دل میں لیے واپس آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے ایکسرے کرانے کو کہا اور بعد میں دوائیں بدلنے یا تجویز کرنے کو کہا۔ اس نے بہ مشکل تمام جیسے تیسے ایکسرے کروایا تو ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا کہ مرض آخری سٹیج پر ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مریضہ کو ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ بانو کے دماغ میں کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا پھر کچھ دیر بعد حواس مجتمع کر کے وہ بلی کو لے کر گھر واپس آ گئی۔

ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد گھر میں ایک ہو کا عالم تھا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھیں۔ اس خاموشی کو صرف بلی کی کھانسی توڑتی تھی۔ اس پر بانو اور اماں جیسے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آتی تھیں۔ شام ڈھل رہی تھی۔ رات کے اذیت ناک سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ بانو مسلسل چار گھنٹوں سے بلی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اماں بڑی دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں پھر اس کے قریب آ کر دھیرے سے بولیں۔

''کمر سیدھی کر لو تاکہ بوجھ اٹھانے کے قابل رہ سکو۔''

"اماں! بوجھ اٹھانے کے قابل ہوتی تو میری بلی کی یہ حالت ہوتی کیا؟" اس نے تاسف سے کہا۔

"تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اللہ کی مرضی یہی ٹھہری۔"

"اب کیا کروں میں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"کچھ نہیں صبح اسے ہسپتال داخل کرا دیتے ہیں۔ اللہ ٹھیک کر دے گا۔"

"مگر......؟"

"سرکاری ہسپتال میں اتنا خرچا نہیں ہوتا۔ تم فکر نہ کرو۔" اماں نے دلاسا دیا۔

"کچھ پیسے تو چاہیے ہوں گے؟" وہ فکرمندی سے بولی۔

"ٹھیکیدار صاحب کی بیوی سے ادھار لے لیتے ہیں۔" اماں نے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔

"کیا سوچنے لگیں؟"

"اگر اس نے انکار کر دیا تو۔" خدشہ اس کے ہونٹوں پر آ کر چپک گیا۔

"تو یہ گھر بیچ دیں گے۔ اپنی بلی کو بچانا ہے۔" ایک دم ہی اماں شدت غم سے رونے لگیں تو بانو تڑپ اٹھی۔

"نہیں، نہیں اماں! آپ نے ہمت چھوڑ دی تو ہمارا کیا ہوگا؟ آپ فکر نہ کریں میں کل بلی کو ہسپتال لے جاؤں گی۔" اماں نے آنکھوں کے کنارے صاف کیے۔

بانو نے ہسپتال لے جانے کے لیے کچھ ضروری سامان اکٹھا کیا۔ بلی کو اٹھا کر دودھ اور ڈبل روٹی کھلائی۔ دوائیں دیں اور گود میں سر رکھ کر سلا دیا۔ وہ سو گئی تو خود بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ مگر جیسے جیسے رات آگے کی طرف بڑھی بلی کی بیماری جاگ گئی۔ کھانسی کی وجہ سے سانس لینا محال ہو گیا۔ اس کو دہرا ہوتا دیکھ کر وہ دونوں بے کل ہو گئیں۔ ساری رات آنکھوں میں نکل گئی۔ صبح تک بلی اور زیادہ نڈھال ہو گئی تھی۔ بانو کی رات بھر جاگنے سے اپنی حالت غیر ہو رہی تھی مگر وہ پوری قوت سے اٹھ کر باورچی خانے میں گئی۔ چائے بنائی۔ اماں کو دی۔ بلی کو دی۔ خود جلدی جلدی پی۔ باورچی خانے میں برتن سمیٹ رہی تھی کہ اماں دروازے پر پہنچ گئیں۔ ان کے ذرا پیچھے وہ بھی جا کھڑی ہوئی۔ دروازے کے عین درمیان میں ٹھیکیدار صاحب کی نوکرانی فیضان پریشان حال کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اماں نے پوچھا۔

"آمنہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے بہت چوٹیں آئی ہیں۔"

"اللہ خیر! کب کیسے؟" اماں دکھ سے چلا اٹھیں۔ بانو کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔

آمنہ ٹھیکیدار صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بلی کی ہم عمر تھی۔

"رات کو سب بچے چھت پر چڑھے تھے۔ سیڑھیاں اتر رہی تھی چھوٹے بلال نے دھکا دے دیا۔ رات سے ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ بیگم صاحبہ نے صدقے کا بکرا منگوانا تھا۔ رات میں بکرا نہیں ملا تو یہ صدقے کے پیسے تمہیں بھیجے ہیں۔" فیضاں نے روانی سے ساری تفصیل پیش کر دی اور مٹھی میں دبے پانچ نیلے نوٹ اماں کو پکڑا دیئے۔ اماں کا ہاتھ لرزا مگر وہ پیسے مضبوطی سے پکڑ لیے۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس کا دل پھڑ پھڑایا، لب تھرتھرائے، قدموں میں لرزش ہوئی، دل چاہا کہ پیسے چھین کر فیضاں کو واپس دے دے۔ مگر اماں کی آنکھ کے اشارے نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ فیضان جا چکی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اماں کو دیکھ رہی تھی۔ جب کہ اماں کے چہرے پر اس کے ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ جواب تھا گہری جامد خاموشی۔ وہ خاموشی میں آواز کی منتظر تھی۔ آواز آئی بھی تو فقط اتنی۔

"بانو! بلی کو جلدی ہسپتال لے چلو۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اماں نے تالا چابی اٹھائے تو وہ سمجھ گئی کہ اماں خود بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے بلی کو اٹھایا۔ اس کا ایکسرے، دواؤں کا تھیلا اور نسخے اٹھائے۔ اماں نے باہر نکل کر گھر کے دروازے پر تالا لگایا اور توانا صحت مند انسان کی طرح تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگیں۔ وہ دانستہ بانو سے نظریں چرا رہی تھیں۔

سارے راستے بانو ان کے چہرے کی خاموشی اور مٹھی میں دبے نیلے نوٹوں کو دیکھتی رہی۔ رکشے سے ہسپتال کے گیٹ پر اتر کر اماں نے ان نوٹوں میں سے ایک نوٹ رکشے والے کو دیا جس میں سے اپنے کرائے کے پیسے کاٹ کر اس نے بقایا پیسے واپس کر دیئے۔ بانو کا دل مسلا جا رہا تھا۔ وہ سخت اضطراری کیفیت سے دو چار تھی۔

پھر بلی کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ دو تین ڈاکٹروں نے اچھی طرح بلی کا معائنہ کیا۔ جلدی سے دوائیں لکھیں اور نسخہ بانو کو پکڑایا مگر اماں نے اس کے ہاتھ سے نسخہ جھپٹ لیا۔

"اماں! یہ نسخہ مجھے دے دو۔" اس نے دبے دبے لہجے اور اداس نگاہوں سے انہیں

کچھ یاد دلانا چاہا۔

''بانو! دنیا کے دستور اس طرح نہیں بدلے جاسکتے۔ بلی کی زندگی کے لیے دوائیں چاہئیں۔'' اماں نے بہت دھیرے سے اس کے کان میں کہا۔

''نہیں اماں! میرا دل نہیں مانتا۔ میری بلی کو کچھ ہوگیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔'' اس نے اصرار کیا۔

''اللہ خیر کرے یہ وہم دل سے نکال دو۔ قدرت کے فیصلے انسان کی بھلائی کے لیے ہوتے ہیں۔'' اماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں جانتی ہوں مگر میں کسی کی مصیبت اپنی بلی تک کیسے جانے دوں؟'' وہ مصر تھی۔ اماں بضد تھیں عین اسی وقت بلی کو پھر شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کے منہ سے خون آنے لگا۔ وہ دونوں سب کچھ بھول کر اس پر جھک گئیں۔ آوازیں دے کر ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ آتے ہی برس پڑا۔

''بی بی! ابھی تک دوائیں کیوں نہیں آئیں؟'' تب اماں نے اس کی وحشت ناک خاموشی کا مطلب سمجھ کر اسے ایک ہرا نوٹ اور نسخہ تھما دیا۔ وہ تیز مگر مردہ قدموں کے ساتھ دوائیں لینے چلی گئی۔

دوائیں آئیں، بلی کو دی گئیں۔ وہ بے دلی سے بیٹھی دیکھتی رہی۔ اس کا دل بلی کی الجھی سانسوں اور بے کل پھڑ پھڑاتی پسلیوں کے بیچ اٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی ویرانی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ بلی کی بے چین غنودگی اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ اس کا بار بار پلکیں اٹھانا گرانا بانو کے لیے حزن بنا ہوا تھا۔ اس کے خشک نیم مردہ ہونٹوں پر بے بسی و بے چارگی کی کیفیت عیاں تھی۔

اماں بڑی دیر سے رنجیدہ نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی دلی حالت کی بے بسی سمجھتی تھیں۔ روح کے آزار سے واقف تھیں۔ ان سے کچھ بھی تو مخفی نہیں تھا مگر بے بس تو وہ خود بھی تھیں۔ لاچار تو وہ بھی ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود کہ ابھی دو نیلے نوٹ ان کی مٹھی میں محفوظ تھے۔ حالات سے لڑنے کی کچھ طاقت تھی ابھی ان کے بوڑھے کمزور ہاتھوں میں۔ مگر یہ بات بانو کو بتانے کی ہمت نہیں تھی ان میں۔ زبان جیسے ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ الفاظ پتھر کے ہوگئے تھے۔ بلی سے نظر اٹھا کر تاسف سے چور نظروں سے اسے دیکھ کر

دکھی ہو رہی تھیں۔ اچانک ہی بلی کے منہ سے غرغراہٹ کی سی آواز پیدا ہوئی تو دونوں ہی خوف زدہ ہوگئیں۔ لحہ بہ لحہ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھ رہی تھی۔ بلی کے سانس کی دھونکنی اس کی دھڑکنوں میں سرد سناٹا پھیلا رہی تھی۔ بلی زور سے امی کہہ کر چلائی تو بانو کا ہاتھ اس کی ننھی سی کلائی پر نرم پڑ گیا۔ آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں اور اماں سے بولی۔

''اماں! چلو گھر چلیں۔ باقی نیلے نوٹ خرچ کرنے کا وقت آ گیا۔'' اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''ب...... بانو؟'' اماں کے حلق کے بیچ آواز معلق ہوگئی۔

''ہاں اماں! آمنہ کی ماں جیت گئی۔ بانو ہار گئی۔'' اس کے کرب ناک لہجے میں اتنی صداقت تھی کہ اماں کو بلی کی پرسکون خاموشی سے گواہی مل گئی۔



پکی سڑک

ملکانی حاجرہ کی نظریں تسبیح پڑھتے ہوئے بار بار ملک سخاوت کی طرف اٹھتیں اور پھر پریشان ہو کر لوٹ آتیں۔ آج پھر سخاوت لرزتے خشک کھردرے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ٹٹول ٹٹول کر برآمدے کی دیوار پر لگے پرانے سے شیشے میں خود کو تلاش کر رہے تھے۔ گرد آلود شیشے سے جھانکتی آنکھوں میں وحشت ناک ویرانیاں ہی ویرانیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

پچکے گال، سوکھے پپڑی زدہ ہونٹ' جن پر کرب ناک لفظوں کی داستانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر داستان کی ایک ایک لکیر میں ہزار ہا کڑوے جملوں کا زہر ا بھرا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر پھیلے خشک زہر کو چاٹنے کیلئے منہ کھولا تو زبان باہر نکلی کی نکلی رہ گئی۔ وہ تو گوشت کی نرمی اور اصل رنگت کھو چکی تھیں۔ کسی قدیم چٹان سے ٹوٹا کوئی ناہموار حصہ تھا۔ کہیں سے سیاہ اور کہیں سے بھورا۔

''آ... آ... ''حلق سے کرب ناک آواز نکلی تو خوف نے چیخ کی شکل اختیار کر لی۔

حاجرہ نے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور جائے نماز سے اٹھ کر ان کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

''آ... آ... ''اس ادھوری پکار میں ہر جوانی سے ادھیڑ عمر تک کے فسانے تھے۔

''کیا بات ہے ملک صاحب! آج پھر وہی دورہ پڑ گیا ہے کیا؟''

''حاجرہ! ملکانی! دیکھ میری زبان کیسی ہو گئی ہے؟ اور یہ دیکھ میری آنکھیں ویران ہیں۔'' ملک سخاوت نے پوری طاقت سے جہاں تک ہو سکا زبان باہر نکال کر دکھائی۔ آخری حد تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھائیں۔ حاجرہ نے بالکل اس طرح گردن ہلائی جیسے کوئی ہزار مرتبہ کی دیکھی فلم کو دیکھتے ہوئے بے زاری سے ہلائے۔ پرانی فلم ہی تو تھی جسے حاجرہ تقریباً

پانچ سال سے دیکھ رہی تھی۔ جس میں نہ محبت کے لطیف چسکے تھے اور نہ جوانی کی مستی بھری چہلیاں! ایسی بدمزہ منہ تک کڑوا کر دینے والی فلم سے تو وہ دلی طور پر بیزار ہو چکی تھی مگر بار بار دیکھنے پر مجبور تھی۔

''تو بولتی کیوں نہیں ملکانی!؟'' اس کی خاموشی پر ملک سخاوت کے خشک کھردرے ہاتھوں میں برائے نام سی جان آ گئی۔ اس کے بھاری کندھے ہلا ڈالے تو وہ بولیں۔

''کیا بولوں؟ بھول گئے تم! پچیس سال پہلے اس بڑی حویلی میں قدم رکھتے ہی میری زبان پر بڑی ملکانی نے تالہ ڈال دیا تھا اور پھر اس تالے کی چابی جانے کسی دریا میں پھینکی تھی یا کسی قبر میں دبا دی تھی۔ پھر حویلی میں کسی نے میری آواز سنی کیا؟ تم نے بھی کبھی نہیں سنی۔ مجھے تو خود معلوم نہیں کہ زبان کیسی ہوتی ہے؟ ہوتی بھی ہے کہ نہیں؟

''حاجرہ! میری زبان تو تو نے سنی ہے۔ پھر یہ کیسے بدل گئی؟ اب مجھ سے بولا کیوں نہیں جاتا؟''

''ہاں سنی ہے۔ سنی ہے تمہاری زبان اور ملک سخاوت زبان کا جلال دیکھا بھی ہے۔

''تو بتا میری زبان نرم گوشت کی زبان تھی نا؟''

''ہاں! بالکل۔ کم عمر بکری کے گوشت کی طرح نرم اور گلابی تھی تمہاری زبان۔ پر اس زبان کو تو اس حویلی کی اونچی اونچی فصیلوں اور تاریک غلام گردشوں میں گونجتی۔ کرلاتی ہچکیاں اور سسکیاں نگل گئیں۔ وہ صرف پتھر کی زبان رہ گئی۔ تم بولتے تھے۔ دیکھتے تھے ملک سخاوت! سن نہیں سکتے تھے کیوں کہ بہرے سنتے نہیں۔

''کون کہتا ہے میں بہرا ہوں؟'' ضعف پیری سے لرزتا جلال ذرا دیر کو تلملایا جیسے ضعف پیری میں مردانگی کا چراغ کچھ دیر کو جل کر بجھ جائے۔

''بڑی ملکانی کہتی تھیں کہ تم تو پیدائشی بہرے ہو۔''

حاجرہ نے تلملائے جلال پر چلو بھر تیل ڈالا تو وہ اور تڑپے۔

''بہرے نہ ہوتے تو حویلی کے در و بام سے لپٹتی ہچکیاں۔ سسکیاں نہ سن لیتے۔''

''حاجرہ! میں بہرا نہیں ہوں۔ میں ملک سخاوت ہوں میں سن سکتا ہوں۔''

''اب کیا حاصل؟ سن سکتے تھے تو اس وقت سنتے جب استانی جمیلہ کے کپڑے لیر

لیر کر کے اس سے اپنی گندی پیاس بجھائی تھی۔ اس کی منتیں ترلے کچھ نہیں سنے تھے۔ اپنے پالتو وفاداروں کو بھی بھنبھوڑنے کا موقع دیا تھا۔ اس وقت میں نے کپڑا ڈالا تھا اس پر اور اس کی سرد اکڑی ہوئی ٹانگوں کو گھاس کی چادر بڑی ملکانی نے دی تھی اور جب بے گناہ فیض محمد کے ٹوکے سے ہاتھ کٹوائے تھے اس کی دردناک چیخوں سے حویلی کانپ رہی تھی۔ میں نے دیکھا تھا تم اس کے بالکل قریب تخت پر بیٹھے کمداروں سے ٹانگیں دبوا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور وہ۔''

''چپ! بس کر کہیں میں بہرا نہ ہو جاؤں۔''

''بہرے تو تم ہو ملک سخاوت! آج بھی اور اس وقت بھی تھے جب دسمبر کی سرد رات میں مائی نوراں اور اس کی جوان بیٹی کو ان کے گھر سے بے گھر کیا تھا۔ رات بھر وہ دونوں حویلی کے گیٹ پر ملک صاحب! رحم کرو۔ رحم کرو کی فریاد کرتی رہیں۔ تم شہری دوستوں کے ساتھ گرم کمرے میں چائے پیتے رہے۔ میوہ کھاتے رہے۔ شہری جوانیوں کے ناز اٹھاتے رہے اور وہ۔''

''او بس کر حاجرہ! میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔''

''آج ہی تو کہنے کا موقع ملا ہے کہ اب تم میری چٹیا نہیں کھینچ سکتے۔ میرے سینے پر جلتی سگریٹ نہیں بجھا سکتے۔''

''اگر حوصلہ نہیں ہے تو پھر بھی برداشت کرو۔ جب زبان کا مختار تھا تو کیا کچھ نہیں کیا؟ میں تو ساری حیاتی اس تالے کی حفاظت کرتی رہی جو بڑی ملکانی نے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ بہت دفعہ چاہا کہ تالا توڑ ڈالوں۔ چیخوں، چلاؤں، کم سے کم اپنے درد پر تو رودوں۔ مگر بڑی ملکانی سمیت کسی نے وہ تالا توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اب وہ وقت آگیا ہے ملک سخاوت کہ حویلی نے تمہیں شناخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ نہ اب زبان تمہاری ہے اور نہ آنکھیں۔ یہ سچ مچ تبدیل ہو گئی ہیں بلکہ سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ پرانے قبرستان جیسی حویلی ہے۔ اس میں تم اور میں بیمار جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ آج وہ سب حکم کے بندے کہاں ہیں؟ انہیں بلاؤ، پکارو، پکارو کہ کوئی ہے؟'' حاجرہ نے اس کے ذہن میں سلائی پھیری۔

''کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ اوئے ملکانی! کوئی نہیں آتا۔ چل مجھے یہاں سے لے چل

کہیں میں سارے کا سارا پتھر کا نہ ہو جاؤں۔ میں ملک سخاوت ہوں۔ میری پہچان نہ کھو جائے۔ چل کہیں۔''

''بیٹھ جاؤ ملک صاحب! نہ اب کوئی پناہ ہے اور نہ پہچان! جب کوئی ظالم بنتا ہے تو وہ صرف فرعون ہوتا ہے جانتے تم نے امریکہ جا کر بھی کیا پڑھا؟ میں نے تو گاؤں کے اسکول میں یہ سبق پڑھ لیے تھے۔'' وہ ہمدرد بیوی بن کر بولی۔

''اوئے تیرا مطلب ہے فرعون ہوں۔ میری زبان فرعون جیسی ہے اور آنکھیں بھی اس کے جیسی ہیں۔'' ان کی آواز فرعون ہونے کے خوف سے لرزنے لگی۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ پر اتنا پتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی دنیا کیلئے ظالم کی پہچان ہے۔ بکسے میں بند بے جان جسم ہمیشہ کیلئے سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی اور ظلم کو پسند نہیں کیا۔'' حاجرہ چند لمحوں کو فرعون کے ظالمانہ دور حکومت میں پہنچ گئی اور خوف کے خدا سے تھر تھر کانپنے لگی۔

''مجھے فرعون مت کہو۔ میں ملک سخاوت ہوں۔'' وہ پوری قوت سے چلائے۔ اپنی شناخت کی فکر نے انہیں دیوانوں کی طرح پھر شیشے کے سامنے کھڑا کر دیا وہ چہرہ، آنکھیں اور زبان دیکھنے لگے۔ حاجرہ نے دکھ سے سرد آہ بھری۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تم فرعون ہو؟''

''پھر مجھے آوازیں کیوں آ رہی ہیں؟ غور سے سنو باہر شور ہے۔ سب مجھے فرعون کہہ رہے ہیں۔'' حاجرہ نے غور سے سنا اور بولی۔

''ہاں! شور ہے تو، مگر تم نے کیسے سن لیا کہ وہ فرعون کہہ رہے ہیں۔''

''وہ کہہ رہے ہیں۔ مجھے باہر لے چلو۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ میرے اندر باہر کہیں فرعون نہیں۔ میں ملک سخاوت ہوں۔'' ملکانی حاجرہ واضح طور پر ملک سخاوت اور ملک صاحب کی آوازیں سن رہی تھیں۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ ملک سخاوت کو سہارا دے کر حیرت کی گھڑی سے نکلنے ہی والی تھیں کہ بہت سے لوگ وہیں آ گئے۔

''ملک صاحب! آپ کے دادا ملک اللہ بخش کی قبر پکی سڑک کے عین درمیان میں آ رہی تھی۔ وڈے افسروں نے امام مسجد کے کہنے پر جگہ بدلوانے کیلئے قبر کھدوائی تو سبحان اللہ۔ ملک صاحب! چار چفیرے خوشبوئیں پھیل گئیں۔ تازہ گلاب اور موتیے کی خوشبوئیں۔''

"ملک صاحب! ذرا چل کے دیکھو! سارا گاؤں جمع ہے۔ وڈے ملک صاحب کی آنکھیں ہونٹ۔ ناک نقشہ ویسے کا ویسا ہے۔"

"ملک صاحب جی! یہ تو اللہ نے کرشمہ دکھایا ہے چل کے تے ویکھو۔"

"اچھا! تم جاؤ۔ سب جاؤ۔" ملک سخاوت کی زبان نے فقط اتنا کہا۔

"ملک صاحب! یہ تو تمہاری واپسی کا اشارہ ہے۔ جاؤ جلدی جا کر دیکھو اور یقین کر لو کہ تم پیدائشی بہرے نہیں۔ وارثی نہیں۔ تمہیں اپنے دادا ملک اللہ بخش کی طرف لوٹنا ہے۔" حاجرہ نے کمزور جسم میں جان ڈال دی اور آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسو دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" وہ جلدی سے بولے۔

"کڑی مشقت سے، کڑے حوصلے سے، ڈھونڈو فیض محمد کو۔ مائی نوراں کو اور مجاور بن جاؤ استانی جمیلہ کی قبر کے۔ ان سب کے پاس تمہارے ظلموں کا کتابچہ ہے۔ وہ کانٹے پر تول کر برابر کا بدلہ بھی لیں تب بھی تمہارا نقصان نہیں۔ جاؤ اپنی زبان اپنی آنکھیں گزرے وقت سے واپس لو۔"

"سالوں پرانا زنگ آلود تالا ٹوٹنے کے بعد حاجرہ کیسی بصیرت افروز باتیں کرنے لگی تھی۔" ملک سخاوت نے حیرت سے سوچا اور افسردگی سے پوچھا۔

"او بختاں والی! گزرے وقت سے کب کسی کو کچھ ملا ہے؟"

"جس طرح انسان اپنے آبائی گھر، محلے کی تلاش کیلئے ماضی میں سفر کرتا ہے اسی طرح اعمال کی فصلوں کا حساب کتاب کرنے کیلئے گزری رتوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں الٹے قدموں۔ الٹا سفر کرنا ہے تاکہ سیدھے قدموں سیدھی راہ مل سکے۔ جاؤ جا کر دیکھو۔ دیر ہو گئی تو پھر تیری قبر بھی کسی پکی سڑک کے بیچ آجائے گی اور کوئی وڈا افسر تیری قبر کھدوائے گا تو لوگ کیا کہیں گے؟" حاجرہ نے کندھے پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر جگایا تو ملک سخاوت نے اپنے ہاتھوں سے حاجرہ کے ہاتھ کندھے سے ہٹائے اور قدم اٹھائے۔ پہلی بار سننے والی آوازوں کی جانب...... پکی سڑک کی طرف...... جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ ملک سخاوت! ملک سخاوت! ملک سخاوت!



مائیں نی

اسے شہر آئے آج پورے پانچ سال تین مہینے ایک دن ہو گیا تھا۔ "جہانگیر پیلس" کے خوبصورت ٹیرس پر بیٹھ کر وہ وقت کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر نہ وقت کبھی رکا اور نہ اس کی مٹھی میں بند ہوا۔ گھبرا کے وہی مٹھی کھول کے دور سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں، آتے جاتے رکشے دیکھنے لگتی۔ کبھی دل شرارت کرتا کہ اس رکشے میں تیرا ابا آرہا ہے۔ کبھی ذہن سمجھاتا کہ یہ دور سڑک سے جا کر واپس نہ آنے والی کسی بس میں، کسی گاڑی میں کبھی نہ کبھی تو بھی اپنے گھر، اپنے گاؤں ضرور جائے گی۔ یہی سپنے بنتے پانچ سال، تین مہینے ہو گئے تھے اور ان کا لمحہ لمحہ رانی کی انگلیوں کی پوروں پر محفوظ تھا۔ بلکہ ان پوروں میں تو وہ زندہ تھی۔ سانس لیتی تھی۔ فرصت کے انتہائی مختصر وقت میں اپنے لکیروں زدہ ہاتھ پھیلا کر اپنی قابلیت کے مطابق گنتی گننے لگتی۔ ایسے میں قادر کہیں سے آٹپکتا۔ قہقہہ لگا کر اس کی قابلیت کا پول کھول دیتا۔ کبھی کبھی وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر دل کا بوجھ کم کر لیتی۔ مگر کبھی کبھی جب شدت سے گاؤں کی، اپنے کچے گھر کی، ساتھ جھولا جھولنے اور کچی کیریاں توڑنے والی سکھیوں، سہیلیوں کی اور اپنے بہن بھائیوں کی یاد میں بے قرار ہوتی تو ایسے میں قادر سے خوب لڑتی جھگڑتی۔ کئی دن منہ پھلائے رکھتی اور پھر قادر کو اپنے گاؤں کی ساتھی کو منانے کیلئے ہزار جتن کرنے پڑتے تب کہیں جا کے وہ مسکراتی۔ قادر اس کے بھولے معصوم چہرے پر تاسف بھری نظریں ڈال کر صبر کی کڑوی گولی اس کی بے ضرر زبان کے نیچے رکھ دیتا۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

"تو بالکل جھلی ہے۔ اوئے یہ بتا کیا ہیرے لگے ہیں گاؤں میں۔ چار چھپرے

بھوک' بیماری اور گھر میں کونسا ہن برس رہا ہے۔ تیرے ابے کی کھوں، کھوں اور ماں کی جلی کٹی باتیں ۔ ریل کے ڈبے سے بھی چھوٹا کچا کوٹھا اور گند کے ڈھیر پر بھنبھناتی مکھیوں جیسے تیرے بہن بھائی۔ کبھی ایک بیمار کبھی دوسرا۔ مالکوں کے کھیتوں میں فصلیں پکتی ہیں اور تیرے میرے گھر میں فاقے ہی ہوتے تھے۔ بھول گئی ہے کیا؟ اور یہ بھی بھول گئی ہے کہ حویلی میں چھوٹی بی بی کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ترستی تھی۔ قادر نے تلخی' ترشی' مٹھاس سب سمیٹ کر ایک سانس میں تقریر کر ڈالی۔

''یہ باتیں بتانے سے کیا میں بہل جاؤں گی؟'' اس نے ٹھنک کر پوچھا۔

''بہل جائے گی تو اچھا ہے۔ ورنہ جب رہنا یہاں ہے تو پریشان ہونے کا فائدہ۔ تیرے گھر میں یہاں سے روٹی جاتی ہے۔ تیرے گھر والے بہت خوش ہیں۔ میں تیرے گھر ہو کر آتا ہوں۔ وہ تیرے لیے پیار بھیجتے ہیں۔ تو اور تیرے جیسی بہت سی رانیاں' شہزادیاں ان بڑی بڑی حویلیوں، کوٹھیوں کو سجانے کیلئے پیدا ہوتی ہیں۔'' قادر نے اس کے نین کٹورے مزید اداسیوں سے بھر دیئے۔''

''تو، تو روز ہی گاؤں جاتا ہے۔ کسی روز مجھے لے چل۔ میں تیرے ساتھ ہی آجاؤں گی۔''

میں بھی تو مالکوں کی مرضی سے جاتا ہوں ۔ میری گود میں تھوڑی جائے گی۔ بیگم صاحبہ سے چھٹی لے لے میں کل سویرے جاؤں گا۔''

''بیگم صاحبہ! تو کبھی چھٹی نہیں دیں گی ۔ آج تک نہیں دی۔ یاد ہے میری سہیلی بالی کی شادی پر جانے کیلئے میں نے ایک چھٹی مانگی تھی لیکن بیگم صاحبہ نے سو بہانے بنا کر روک دیا تھا۔''

''چھوٹی بی بی سے سفارش کرالے۔ وہ تو تیرا خیال کرتی ہیں۔'' قادر نے اپنی فہم کے مطابق اس کی راہ میں امید کا ایک جگنو چھوڑا۔ مگر وہ چپ چپ سی اٹھ کر چلی گئی۔

''وہ جانتی تھی کہ بیگم صاحبہ' صاحب کوئی اسے جانے نہیں دے گا۔ کوئی نہیں چاہے گا کہ پوری کوٹھی میں پھرکی کی مانند گھومنے والی دبلی پتلی سی رانی ایک دن تو دور کی بات ایک آدھ گھنٹے کیلئے بھی کہیں جائے۔ پندرہ سو روپے میں اس کی ہر سانس تک خریدنے والوں کیلئے اس کے دل میں مچلنے والی کسی خواہش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مہینے کی پانچ، چھے تاریخ کو اس

کا ابا آ کر گھٹنوں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان پیسوں کا انتظار کرتا جو اسے بیٹی کی ہر خوشی کے بدلے ملتے۔ اسے بھی شاید بیٹی یا بیٹی کی خوشی سے سروکار نہیں تھا۔ تھوڑی بہت دیر کو وہ باپ کے آنے کی اطلاع پر اس کے پاس بیٹھتی ۔ گلے شکوے کرتی، آنسو بہاتی، منت کرتی، مگر سہمے ہوئے انسان کی طرح وہ اسے فقط یہ کہہ کر لوٹ جاتا۔

''بس تھوڑے دنوں کی بات ہے ۔ پھر تجھے پکی چھٹی کرا کے لے جاؤں گا۔'' وہ اس جھوٹی تسلی پر پھر سے جینے کا حوصلہ اکٹھا کر لیتی۔

اس وقت بھی ٹی وی لاؤنج کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے وہ ابے کی اس تسلی کو یاد کر رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اور صاحب ڈنر سے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ شدید سردی میں، فرش کی ٹھنڈک اس کے جسم میں ٹھنڈک کی جگہ حرارت پیدا کر رہی تھی۔ کپکپی سی آئی تو اندازہ ہوا کہ پورا جسم گرم سا ہو رہا ہے۔ اور جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ سوچا کہ چھوٹی بی بی کے گرم کمرے میں بیٹھ کر انتظار کر لے۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہ سو چکی ہوں گی۔

واپس وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد بیگم صاحبہ اور صاحب آ گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''رانی! اچھی سی کافی بنا کر کمرے میں لے آؤ۔ باہر بہت سردی ہے۔'' جہانگیر صاحب کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ اس نے مشینی انسان کی طرح اثبات میں گردن ہلا دی۔ مگر بیگم صاحبہ کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر پہلے ان سے بات کرنے کی سوچی۔ لیکن وہ اس کے سوال سے پہلے بول اٹھیں۔

''رانی! صبح صاحب نے گاؤں جانا ہے۔ ناشتہ جلدی تیار کرنا۔'' اس کا دل ملال سے بھر گیا۔ اب تو امکان کا ہر راستہ بند ہو گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ انھیں دیکھتی ہوئی وہاں سے جانے لگی تو انھوں نے خود ہی پوچھ لیا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''جی۔'' حلق میں کانٹے اُگ آئے۔

''رو کیوں رہی ہو؟'' تشویش میں بھی برہمی موجود تھی۔

''بس، جسم میں درد ہے اور آگ سی نکل رہی ہے۔''

''او بخار لگتا ہے۔ یہ لو یہ دو گولی کھا کر سو جانا۔'' انہوں نے کمال درجے کی اپنائیت اور دیکھ بھال کا مظاہرہ کیا اور پرس اٹھا کر اس میں سے دو ڈسپرین نکال کر اس کی جلتی ہتھیلی پر

رکھ دیں۔ یوں آج بھی دل کی بات دل میں لئے وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ پانچ سال، تین مہینے میں یہی کچھ تو ہوا تھا۔ وہ جب بیقرار ہو کر ایک چھٹی مانگنے کی کوشش کرتی۔ مگر اس کے لب ہلنے سے پہلے یا ہلنے کے بعد سے ضروری کام، مجبوریاں اس کو چپ کرا دیتیں۔

''دیکھو! آج رات مہمان آ رہے ہیں۔''

''ہمیں شادی میں شریک ہونا ہے۔''

''صاحب کی اسلام آباد میٹنگ ہے۔''

''چھوٹی بی بی کے امتحان ہو رہے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ اور وہ زہر کا گھونٹ بھر کے کام کاج میں کوہلو کے بیل کی طرح جت جاتی۔ مگر شام ڈھلے جب ذرا دیر کو گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے قادر کو فرصت ملتی تو اس سے باتیں کر کے دل کا بوجھ کم کرتی۔ وہ اس کی باتیں دھیان سے بے دھیانی سے سنتا۔

''تو سچ کہتا ہے قادر! ہمارے تو اپنے ہی ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ انہیں ہم سے زیادہ ہماری مزدوری سے محبت ہوتی ہے۔''

''ان کی مجبوری ہوتی ہے۔ مالکوں سے وفاداری اور گھر کا نظام چلانے کیلئے اپنی اولاد ہی نظر آتی ہے۔ کب سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔'' وہ قادر کی بات پر خشک ہونٹوں پر جمی پپڑیاں نوچنے لگتی۔ کہیں کہیں سے خون رسنے لگتا تو قادر اپنی انگلی سے لگا کر اسے دکھاتا۔

''سچ بات تو یہی تھی کہ گاؤں کے چودھری صاحب نے مال غنیمت سمجھ کر اپنے جگری دوست جہانگیر کے پاس اسے اور قادر کو ڈھور ڈنگروں کی مانند ڈالے میں سوار کرا کے شہر بھیجا تھا۔ اس کا تو پہلا کام اور پہلا گھر تھا۔ مگر قادر پہلے گاؤں میں چودھری صاحب کی ڈیوٹی دیتا تھا۔ گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں آنے جانے کیلئے چودھری صاحب کے پاس جتنی گاڑیاں تھیں اتنے ہی گاؤں کے گبھرو جوان ان کے وفادار تھے ڈرائیور تھے۔ قادر ان کے اعتماد کا بندہ تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ جہانگیر صاحب کو قادر عطا کیا گیا۔ قادر اور ایک شہری ڈرائیور جہانگیر صاحب کی گاڑیاں چلاتے تھے۔ قادر گاؤں آنے جانے والی گاڑی چلاتا تھا۔ تقریباً دوسرے تیسرے دن زمینوں کے کام کاج کے سلسلے میں اسے جانا پڑتا تھا۔ جب وہ گاڑی گیٹ سے نکالتا تو اس کا دل گاڑی کے پہیوں سے لپٹا چلا جاتا۔ مگر وہ کرماں ماری خود

ہی سسکیاں لیتی رہ جاتی۔

رات دو گولی کھانے سے کچھ بخار کم ہوا تھا۔ مگر جسم میں درد تھا اور ہلکی سی کھانسی شروع ہو گئی تھی۔ صاحب ناشتہ کر کے ہاتھ دھونے کیسنے گئے تو اس نے جلدی سے قادر کے اشارے پر بیگم صاحبہ سے کہا۔

''میں بھی گاؤں چلی جاؤں۔'' جملہ تو بڑا سیدھا اور مختصر تھا۔ مگر بیگم صاحب نے ایسی کم فہم نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ کچھ سمجھ نہ سکی ہوں۔ ایسے میں قادر نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''بیگم صاحبہ! ہم گاؤں جا رہے ہیں تو اس لئے رانی جانا چاہتی ہے۔ شام کو واپس آ جائے گی۔ اسے گاؤں، اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔'' قادر نے پہلی مرتبہ اس کی وکالت کی اور بیگم صاحبہ کے چہرے پر آنے والی غیر یقینی حیرت سے اپنے مقدمہ ہارنے کا اندازہ بھی لگا لیا۔

''اسے یہاں زنجیریں کس نے پہنا رکھی ہیں۔ ضرور جائے لیکن آج نہیں۔ تانیہ بی بی کی سہیلی انگلینڈ سے آ رہی ہے۔ جاؤ جا کر کمرہ صاف کراؤ اور تانیہ بی بی سے پوچھ کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کراؤ۔ انہوں نے جواب قادر کو دیا اور حکم اس کو۔ وہ مایوس سی وہاں سے چلی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب قادر کو سخت افسوس ہوا۔ وہ دانت بھینچ کر گاڑی نکالنے کیلئے گیا۔

''قادر گیا بھی اور شام ڈھلے صاحب کے ہمراہ واپس بھی آ گیا۔ اسے اس سے ملنے یا بات کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ تانیہ بی بی اور ان کی سہیلی کی خدمت کرتے کرتے رات ہو گئی۔ تھک کے چور چور سب سے آخر میں روٹی کا نوالہ توڑا تو قادر آ نکلا۔ اسے اپنے کوارٹر میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ مگر وہ اس کا تمتماتا چہرہ اور نقاہت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''تجھے کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں بس بخار سا ہے۔''

''پھر۔''

''پھر کیا اتر جائے گا۔ گولی کھا لوں گی۔ تو سنا گاؤں میں سب ٹھیک ہیں۔'' بخار کی وجہ سے روٹی کا نوالہ زہر جیسا لگا۔ مشکل سے چبا چبا کر حلق سے نیچے اتارا اور برتن ایک طرف رکھ دیئے۔

''اوئے وہ تو سب ٹھیک ہیں۔ تیری چھوٹی بہن ناجی بس پینگ سے نیچے گر گئی تھی اس کی ٹانگ میں چوٹ لگی ہے۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' بے اختیار اس نے کلیجہ تھام لیا۔

''فکر نہ کر ویسے ٹھیک ہے۔ مجھے تو تیری فکر ہوگئی ہے۔تو تو نچڑتی جارہی ہے۔اتنا کام تو مزدور بھی نہیں کرتے۔

''کام کے واسطے لائی گئی ہوں تو کام تو کرنا ہے۔''

''میں نے سوچ لیا ہے اب کی بار گاؤں جاؤں گا تو بوا کو تیرے گھر رشتہ مانگنے بھیجوں گا پھر تو یہاں نہیں رہے گی۔ بوا کے پاس رکھوں گا۔'' قادر نے محبت پاش نگاہوں سے اس کو دیکھا تو وہ سادگی سے ہنس دی۔

''تو کہتا ہے تو سچ مان لیتی ہوں۔''

مگر قادر کا یہ سچ اس کے یقین میں نہ بدل سکا۔ چند دن بعد قادر گاؤں گیا تو اس کی آنکھوں میں شہنائی کے لال گلابی ڈورے چھوڑ گیا۔ ان کہے جذبے اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ بہکی بہکی چال اور کھوئی کھوئی باتیں اوپر سے دھڑکنوں کا شور اپنے گھر اپنے گاؤں جانے کی شدید آرزو اسے بکل کئے ہوئے تھی۔ اس نے دل کی بات سادگی سے تانیہ بی بی کے سامنے کردی تو وہ کھانا چھوڑ کر بلند قہقہے لگانے لگی۔ آنکھیں ہنستے ہنستے بھیگ گئیں تو اس نے خوف کی کھڑکی سے سر باہر نکالا اور پوچھا۔

''تانیہ بی بی! آپ ہنس کیوں رہی ہیں۔''

''تمہاری بیوقوفی پر۔ اگر قادر تمہیں لے بھی جائے گا تو چودھری صاحب کی حویلی سے بھی دور رہ سکو گی؟ وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئی مگر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ٹانگوں کی طاقت وہیں چھوڑ آئی۔

بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کیلئے جو خیال بھی کریں وہ حقیقت کیوں بن جاتا ہے؟ قادر کی خون آلود میت کو دیکھ کر اس نے سوچا۔ کسی نے دل ہی دل پر گھونسلوں، مکوں کی بارش کردی۔ آنکھوں سے ٹوٹنے والے موتی، دل کی موت پر نوحہ کناں ہو گئے۔ حادثے کا شکار ہونے والا قادر لاش کی شکل میں گاؤں بھیجا گیا۔ صاحب نے چار پانچ نیلے کرارے نوٹ اس کی میت لے جانے والے ویگن کے ڈرائیور کو یہ کہہ کر تھما دیئے۔

''یہ روپے اس کی تدفین کیلئے ہیں۔''

ویگن خاموش، بے زباں و بے آواز قادر کو لیکر گیٹ سے باہر نکلی اور سڑک پر بھاگتی

دوڑتی گاڑیوں میں شامل ہوگئی۔ ٹیرس میں بنا آواز کے سسکیاں بھرتی رانی نے اسے بہت پکارا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ لرزتی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ٹیرس سے نیچے اتر آئی اور خود کو سمجھایا کہ چپ چاپ اس بڑی کوٹھی میں ہی زندگی گزارنی ہے۔ یہ تسلی بھی اسے خود کو دینی تھی اور کون اس کی بھیگی پلکیں صاف کرنے والا تھا۔ قادر کی میت ابھی گاؤں بھی نہیں پہنچی تھی کہ جہانگیر پیلس میں مہمانوں کے قہقہوں اور کھانے کے برتنوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔

قادر کو گئے کافی دن ہو گئے۔ پانچ تاریخ کو اس کا ابا پیسے لینے آیا تو پھر اس کا کلیجہ پھڑ پھڑانے لگا۔ باپ سے ایک دن کیلئے لے جانے کی منت کی۔ اس نے دبے دبے لفظوں میں بیگم صاحبہ سے درخواست کی مگر وہاں سے بڑا مخلصانہ جواب ملا۔

''بھئی ایک دن کی بجائے ہفتے کیلئے لے جانا مگر ہمارے امریکہ سے آنے کے بعد۔ ہم لوگ چھ مہینے کیلئے جا رہے ہیں۔ واپس آکر رانی کو بھیج دیں گے۔ ہماری غیر موجودگی میں گھر کی اچھی طرح دیکھ بھال اسی کو کرنی ہے۔'' اور بات وہیں ختم ہوگئی اس کا ابا جیب گرم کرکے اسے تسلیاں دے کر واپس چلا گیا۔ وہ وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔ یکدم ہی کھانسی کا دورہ سا پڑا تو سانس لینا مشکل ہوگیا۔ کھانستی ہوئی تانیہ بی بی کے کمرے میں گئی۔ دو گولی اور کھانسی کا شربت لے کر واپس آگئی۔ اس کی حالت پر تانیہ بی بی کو ترس آگیا۔ رات ہی ٹی وی لاؤنج میں وہ ماں باپ کے سر ہوگئی۔

''ماما! رانی کب سے اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ اسے چھٹی دے دیں۔''

''بھئی میں نے کب روکا ہے۔''

''آپ نے جانے کب دیا ہے۔ اسے گھر کی یاد ستاتی ہے اور آج کل اسکی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ جانے دیں خوش ہو جائے گی۔''

''پھر ایسا کرو کہ امریکہ جانے کا پروگرام کینسل کر دو۔ اسے گاؤں بھیج دو گھر کی حفاظت ہر آدمی تو نہیں کر سکتا۔'' بیگم جہانگیر نے بیٹی کو لتاڑا۔

''بیٹا! مجبوری ہے ورنہ ایسی کیا بات ہے۔ اگر طبیعت خراب ہے تو فیملی ڈاکٹر کو فون کرکے بلا لو۔'' جہانگیر صاحب نے بیوی کی زبان سمجھ کر بیٹی کو سمجھا دیا۔

''وہ اٹھ کر چلی گئی۔''

''یوں تین ہفتے گزرے تو گاؤں سے منشی کی آمد پر وہ پھر بیگم صاحبہ سے دل کی

بات کرنے ان کے کمرے میں پہنچی تو اس سے پہلے انہوں نے نیا کام بتا دیا۔"

"رانی! ہم نے ویزے کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے۔ ہم تینوں کا سامان پیک کراؤ۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ منشی کو گھر والوں کیلئے پیغام دیکر کام سے لگ گئی۔ صرف تانیہ بی بی اس کی حالت سے پریشان تھی۔ اسے سامان پیک کرتا چھوڑ کے خود ماں سے اس کی سفارش کرنے چلی گئی۔

"ماما! ہم نے ایک ہفتے کیلئے اسلام آباد جانا ہے رانی کو ہفتے کیلئے گاؤں بھیج دیں۔"

"اور گھر کس کے حوالے کر جاؤں۔"

"ماما! ہمارے گھر میں نوکروں کی فوج ہے۔ پھر اکیلی رانی کو ہی آپ نے قیدی کیوں بنا رکھا ہے؟"

"تانیہ! اب ایک لفظ نہ کہنا۔ اسے یہاں کس چیز کی کمی ہے اور جس گھر کی یاد میں وہ تڑپ رہی ہے وہاں کون اس کا ہے؟ ماں باپ کی مرضی تھی تو چودھری یاور نے اسے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ دیکھتی نہیں ہو ہر مہینے اس کا باپ بیٹی سے ملنے نہیں تنخواہ وصول کرنے آتا ہے۔" بیگم جہانگیر نے کھری کھری سنا کر بیٹی کو رخصت کر دیا۔ اس کا اترا ہوا منہ دکھ کر رانی نے بھرپور اداکاری شروع کر دی۔

"تانیہ بی بی! مجھے کہیں نہیں جانا میں تو اس گھر کی خاص ملازمہ ہوں۔ پورا گھر میرے حوالے ہے۔ میں تو اس گھر کی دیکھ بھال کیلئے ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"تم چودھری یاور کی بخشش ہو۔ اپنے والدین کا لالچ ہو۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔" تانیہ بی بی نے دھیرے سے کہا۔ جسے سمجھ کر بھی وہ نہ سمجھ سکی۔

دو دن بعد ان تینوں کی اسلام آباد روانگی تھی۔ وہ بہت مصروف تھی۔ ہلکا ہلکا بخار تھا، کھانسی بھی ستا رہی تھی مگر کوشش کر رہی تھی کہ مالکوں کو پتہ نہ چلے۔ لیکن پھر بھی خانساماں کو اندازہ ہو ہی گیا۔ مگر اس نے دھیرے دھیرے کافی کے نازک کپ دھوتے ہوئے انہیں کہہ دیا۔

"چاچا! باورچی خانے میں گرمی ہے اس لیے تمہیں میرا منہ سرخ نظر آ رہا ہے۔"

"اچھا' لیکن۔"

"لیکن کیا ہوتا ہے چاچا! میں ٹھیک ہوں۔" اس نے ان کی بوڑھی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی۔ اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سمجھوتے کا نیا انداز اختیار کر لیا تھا۔ خاموشی سے کام کرتا۔ جس کا معاوضہ اس کا ابا وصول کرنے آتا ہے اور جا کر گھر کا نظام چلاتا ہے۔ اپنی معصوم فطری سی خواہش کی قربانی سے اس کے رشتوں کو آسودگی مل رہی ہے۔ اس میں ہی بھلائی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے لب سی لئے۔ کسی نے اس پر بھی توجہ نہ دی۔ گھر کی خاص ملازمہ سے کسی کو کتنی خاص دلچسپی ہوتی۔ قادر یہاں اس کا واحد غمگسار تھا۔ جو اس کی باتیں سنتا' دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ جب وہ چڑیا سے دل کی مالک بھوں، بھوں کر کے گھر کی یاد میں آنسو بہاتی تو وہ فوراً اس کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔

"اری، ری! ہش چپ، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا کہ شاید میں نے تجھے چٹکی کاٹی ہے یا تھپڑ مارا ہے۔ مجھے رسوا کرائے گی۔ اور ایسے لڑکیاں ڈولی میں بیٹھے ہوئے روتی ہیں۔"

وہ اس کی باتوں پر سچ مچ روتے روتے ہنس پڑتی۔ تو وہ خوش ہو جاتا۔

"قادر! تجھے جانے کی جلدی تھی تو مجھے اپنے گھر کے سپنے کیوں دکھائے تھے؟" قادر کو یاد کر کے وہ شکوہ کرنے لگی۔ مگر جہانگیر صاحب کی گاڑی کی آواز پر حرکت میں آ گئی۔ یاد آیا ان کا شلوار سوٹ استری کرنا تھا۔ جمعہ کی نماز کیلئے وہ ہمیشہ شلوار سوٹ ہی پہنتے تھے۔

رات نو بجے کی فلائٹ سے وہ تینوں اسلام آباد چلے گئے۔ ڈرائیور فتح محمد نے واپس آ کر گاڑی کھڑی کی۔ اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ وہ قادر کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یہ بات بھی اس کیلئے سوہان روح تھی مگر یہ زندگی کا اصول ہے۔ یہ سوچ کر پرملال طبیعت کو سنبھال کر صبر کر لیتی۔ خانساماں نے سب ملازمین کیلئے کھانا بھجوایا۔ اس وقت وہ کوٹھی کے تمام کمرے لاک کر کے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی جب خانساماں چاچا نے اسے کھانے کیلئے آواز دی۔ مگر طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن پھر بھی وہ ٹرے میں کھانا لے کر اس کے پاس وہیں آ گئے۔ ہلکی زرد ٹمٹماتی روشنی میں جھلنگے سے پلنگ پر وہ دوہری ہوئی پڑی تھی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ رضائی میں بھی ہلکے ہلکے کانپتا جسم صاف نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے پکارا تو اس نے رضائی سے منہ نکال کر دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھی۔ خانساماں چاچا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ

رکھ کے دیکھا تو دکھی ہو گئے۔

''بیٹا! تجھے تو تیز بخار ہے۔''

''اچھا!'' سارے جہاں کی حیرت میں کافی سارا جھوٹ شامل کر کے وہ مسکرائی۔

''تو نے سب کمرے بند کر دیئے۔ کہیں ہیٹر چلا کر سو جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیتی۔'' انہوں نے کہا تو وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''مالکوں کی غیر موجودگی میں ہمیشہ کمرے بند کرنے ہوتے ہیں اور یہ ہے نا اپنا ہیٹر۔'' اس نے رضائی کی طرف اشارہ کیا۔''

''پگلی تو سردی سے کانپ رہی ہے تیز بخار ہے۔ چل، چل کر دروازہ کھول ڈاکٹر صاحب کو فون کرتا ہوں۔''

''چاچا! ایک منٹ، یہ دیکھو کتنی ساری گولیاں بیگم صاحبہ دے کر گئی ہیں۔''

اس نے ہمت سے اٹھ کر گدے کا کونہ پلٹ کر ڈھیر ساری مختلف رنگوں اور شکلوں والی گولیاں انہیں دکھائیں۔''

''پھر کچھ کھا کر یہ گولیاں کھا لو۔''

''بیگم صاحبہ میرا بہت خیال کرتی ہیں۔ اسلام آباد سے آ کر ہسپتال لے جائیں گی۔'' رقت آمیز لہجے میں کہہ کر اس سے دو ڈسپرین کی گولیاں حلق میں رکھیں اور پانی کے گھونٹ سے اندر دھکیل دیں۔ اس سے خانساماں چاچا کو اس بھولی سی لڑکی پر بہت پیار آیا۔ مگر دل کڑا کر کے وہاں سے اٹھ آئے۔''

''آج پانچ تاریخ ہے۔ سات دن جیسے تیسے گزر گئے تھے۔ بخار چڑھتا اترتا رہا۔ کھانسی کبھی زور پکڑ لیتی اور کبھی کم ہو جاتی۔ ایسے میں وہ معمول کے مطابق سب کمرے کھولتی، صفائی ستھرائی کرتی اور پھر بند کر دیتی۔ آج جہانگیر صاحب اور بیگم جہانگیر واپس آ رہے تھے۔ تانیہ بی بی کا کچھ دن اسلام آباد رکنے کا پروگرام بن گیا۔ ان دونوں کی آمد سے پہلے اس نے سب کام نپٹا لئے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری بھی کر لی۔ صاف چمکتے ہوئے بیڈ روم اور باتھ روم دیکھ کر بیگم صاحبہ نے اس کو شاباش دی۔ اور اچھی سی کافی لانے کو کہا وہ کافی لیکر جا رہی تھی کہ عین اس وقت ابا آ گیا۔ باپ کو دیکھ کر ضبط کی ہوئی محبت تڑپ اٹھی۔ دل مچلا کہ آج ابے کے ساتھ گاؤں جاؤں۔ خوش خوش بیگم صاحبہ کو باپ کے آنے کی اطلاع دی۔ تو انھوں نے

کچھ عجیب سے انداز میں پرس سے تین ہرے نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے اور کہا۔

''یہ لو اپنے باپ کو دے دو۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں مل نہیں سکتے۔'' مٹھی میں نوٹ دبا کر رنجیدہ سی ہو گئی۔ جو کہنا چاہتی تھی وہ زبان پر لانے میں ذرا سی دیر ہو گئی اور بیگم صاحبہ فون کی گھنٹی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ سرد آہ بھر کے برآمدے میں اس طرف آ گئی جہاں اس کا ابا کتنے سالوں سے بیٹھتا آ رہا تھا۔ اس نے نوٹ باپ کے ہاتھ میں پکڑا کے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ جیب میں نوٹ ٹھونستے ہوئے دکھی مگر چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ابے نے اس کے آنسوؤں کا مطلب نہ سمجھا۔ فرش پر رکھی پوٹلی اٹھا کر اسے دی۔

''یہ تیری ماں نے پنجیری بھیجی ہے۔'' پہلی مرتبہ ابا اس کیلئے کچھ لایا تھا۔

''کس خوشی میں۔'' اس نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا جس میں حیرت بھی شامل تھی۔

''اوئے تیری بہن تاجی اور بھائی پپو بھی کام پر لگ گئے ہیں۔ چودھری یاور صاحب کی مہربانی سے ہمیں شہر میں کوئی وڈے سیٹھ صاحب کے ہاں کام لگا ہے۔ پورا چار ہزار ملے گا۔ ایڈوانس ملا ہے۔ تیری ماں نے پوری برادری میں لڈو بانٹے ہیں۔ اور تیرے واسطے اپنے ہتھ سے پنجیری بنا کر بھیجی ہے۔'' ابا اپنی خوشی میں بولتا چلا گیا۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر وہ پوٹلی فرش پر رکھ کے بنا کچھ کہے اندر چلی گئی۔ ابا آوازیں دیتا رہ گیا اور جانے کیا کیا بتانا چاہتا تھا۔ مگر کھانسی کے شدید دورے نے پیچھے آنے والی ابے کی آواز سننے کی مہلت نہ دی۔

